بارہ مجلسیں ۱۲

علّامہ السیّد ذیشان حیدر جوادی

فہرستِ مجالس

نام کتاب . . . بارہ مجلسیں

مجموعۂ تقاریر . . . علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

عنوان . . . عرفانِ رسالت

* اشاعتِ اوّل (پاکستان میں) سنہ ۱۹۸۸ء
* تعداد اشاعت ایک ہزار

ناشر . . . احمد بک ڈپو
رضویہ سوسائٹی کراچی ۱۸
کتابت . . . سیّد جعفر زیدی

ملنے کا پتہ

احمد بک ڈپو رضویہ سوسائٹی کراچی ۱۸

باسمہ سبحانہٗ

اس کتاب میں بارہ مجلسیں ایّامِ محرم کی مناسبت سے درج کی گئی ہیں، اور اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ ان کا مطالعہ کرنے والا سرکارِ دو عالم کی مکمّل حیاتِ طیّبہ پر ایک نظر پیدا کر لے۔

یہ کتاب نہ اعلیٰ درجہ کے ذاکرینِ کرام کے لیے ہے اور نہ بالکل مبتدی افراد کے لیے۔

اس میں اوسط درجہ کے اہلِ علم کی رعایت کی گئی ہے۔

اُمید ہے کہ یہ نذرانۂ حقیر بارگاہِ معصومین علیہم السّلام میں قابلِ قبول ہوگا، اور افرادِ قوم بھی مرکزِ توجہ بنائیں گے۔

جوادی

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِى الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ وَاللَّعْنَةُ الدَّائِمَةُ عَلٰى اَعْدَائِهِمْ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ الْحَكِيْمُ فِىْ كِتَابِهِ الْكَرِيْمِ

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ"

اے اہلِ عزا! عزا کے دن آ پہنچے۔ غم کی راتیں، بُکا کے دن آ پہنچے آسمان پر محرّم کا چاند نمودار ہو چکا ہے۔ یہ چاند اپنے ساتھ بیشمار یادیں لیکر آیا ہے اس کی ہر یاد ایک خاص تاثر رکھتی ہے اور اس کی ہر یاد کے ساتھ انسانی زندگی کا ایک مسئلہ وابستہ ہے۔

یہ چاند مختلف منزلیں طے کر کے منظرِ عام پر آیا ہے اور یہ پیغام لایا ہے کہ اسی طرح ۶۱ سنہ ھ میں فاطمہؑ کا چاند سفر کی مختلف منزلیں طے کر کے کربلا کے اُفق پر طالع ہوا تھا۔

یہ چاند اپنے ضعف و اضمحلال سے یہ خبر سُنا رہا ہے کہ حسینی قافلہ میں کچھ نیم جاں بچے بھی تھے جو تکانِ سفر سے اسی طرح مضمحل اور کمزور ہو گئے تھے

یہ چاند اپنی ساخت و وضع سے اس یاد کو تازہ کر رہا ہے کہ کل کربلا کے میدان میں آلِ رسولؐ کے دشمن، ذرّیتِ پیغمبرؐ کے خون کے پیاسے بھی اِسی طرح نیام میں خنجر چھپا کر لائے تھے اور فاطمہؑ کے لال کا خون بہانا چاہتے تھے۔

یہ چاند ہجری سال کا پہلا چاند ہے جو اسلامی تاریخ کے پڑھنے والوں کو اس واقعۂ ہجرت کی یاد دلا رہا ہے حبیب خدا کے رسولؐ نے دشمنوں کے مظالم و مصائب سے تنگ آکر بحکمِ خدا اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ کا رُخ کیا تھا لیکن اربابِ عزا! اسلام کی تاریخ کا یہ عجیب الم انگیز اور حیرت فزا واقعہ ہے کہ ساٹھ سال پہلے نبیٔ اکرمؐ نے اپنا وطن چھوڑا تو مدینہ نے بڑھ کر آپؐ کا استقبال کیا اور اپنی آغوشِ محبت میں آپؐ کو جگہ دی۔ مدینہ آپؐ کے لیے دارالہجرت ہی نہیں بلکہ دارالامن بھی بنا، اور ساٹھ سال نہیں گذرنے پائے تھے کہ اسی مدینہ نے نبیؐ کے لال کو پناہ دینے سے انکار کر دیا اور حسینؑ کو دینِ خدا کی خاطر مدینہ چھوڑ دینا پڑا۔

تاریخ عالم میں اس انقلاب کی مثال نہیں مل سکتی کہ نبیؐ کریم نے مکّہ چھوڑ کر مدینہ کا رُخ کیا تھا اور حسینؑ نے ۲۸ رجب کو مدینہ چھوڑ کر مکّہ کا رُخ کیا۔ کربلا کے فلسفہ پر نظر کرنے والے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُمّتِ اسلامیہ نے نصف صدی کے اندر کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا اور حالات میں کس قدر فرق پیدا ہو گیا تھا کہ نبیؐ کا دارالہجرت حسینؑ کی پناہ گاہ نہ بن سکا۔

یہ حسینؑ ۲۸ رجب کو مدینہ نہیں چھوڑ رہے تھے، نانا کے کلمہ پڑھنے والوں اور اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے ذہنوں کو اُن تلخ حقیقتوں کی

طرف موڑ رہے تھے جن کی طرف توجہ یزیدیوں کے کردار کو بے نقاب کرنے میں مکمل مدد دے سکتی ہے، اور یہ بتا سکتی ہے کہ فاطمہؑ کے لال نے اپنے وطنِ عزیز کو کیوں چھوڑا اور حسینؑ کربلا کن حالات میں گئے۔

یزید اور یزیدیت کے پرستار آج بھی یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ یزید نے اسلام میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور اس کا دین بعینہٖ پیغمبرؐ کا دین تھا لیکن حسینؑ نے روزِ اوّل ہی اس پروپیگنڈہ کی قلعی کھول کر رکھ دی اور یہ واضح کر دیا کہ جو انسان نبیؐ کے لال کو اس کے وطن میں خاموش نہ بیٹھنے دے وہ اسلام کو اس کے اصل مرکز پر کیونکر برداشت کر سکتا ہے جب کہ نواسۂ رسولؐ خاموش ہے اور اسلام قدم قدم پر یزید کے کردار پر تنقید کر رہا ہے۔

محرّم کے اس چاند کے ساتھ روئے زمین کے گوشے گوشے پر صفِ عزا بچھ گئی ہے اور رسولؐ کو اُن کے لال کا پُرسہ دینے والے مسلمان اور انسانیت کو اس کی قدروں کی بربادی پر تعزیت پیش کرنے والے انسان سب اِس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ مسلمانوں کے آنسو اس بات پر بہہ رہے ہیں کہ اُمّت نے اولادِ رسولؐ کی قدر نہ پہچانی۔ حسینؑ کو کربلا میں بُلا کر شہید کر دیا اور دنیا کے دوسرے انسان اِس بات پر اشکبار ہیں کہ انسانیت کے دشمنوں نے انسانیت کے مرقع کو خاک میں ملا دیا، اور حسینؑ سے ملنے والے انسانی درس کا مدرسہ بند کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ زبانِ خنجر کے خاموش ہو جانے کے بعد آستین کا لہو

پکارنے لگتا ہے اور خونِ شہید کی سُرخی آج بھی ان انسانی تعلیمات کو دُہرا رہی ہے جن کا راستہ بند کرنے کے لیے یزید نے تیس ہزار سے زائد فوجوں کی دیواریں کھڑی کی تھیں۔

حسینؑ اگر فقط مظلوم ہوتے تو دنیائے انسانیت ان کے غم میں ہمدردی کے چند آنسو بہاکر خاموش ہو جاتی، یا دورِ حاضر کی رسم کی بِنا، پر چند لمحوں کی خاموشی میں غمِ حسینؑ کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ لیکن حسینؑ کی دُور بیں نگاہوں نے مظلومیت کے ہر خاکہ میں تعلیمات کا ایک رنگ بھر دیا ہے۔ مدینہ چھوڑنے سے لیکر سجدۂ آخر تک حسینؑ کی مظلومیت کے ہر خاکہ میں اسلامی تعلیمات اور انسانی زندگی کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ اِس لیے غمِ حسینؑ صرف چند آنسوؤں تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ آنسوؤں کی چھاؤں میں ان اسباق کو بھی دُہرانا پڑے گا جن کے لیے فرزندِ رسولؐ نے جان قربان کی تھی اور مظلومیت کے خاکہ میں اس رنگ کو بھی دیکھنا پڑے گا جو حسینؑ مظلوم نے اپنے خون کی سرخی سے بھرا تھا۔

تفصیلی تبصرہ آئندہ تاریخوں میں کیا جائے گا۔ اِس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ حسینؑ کسی وقتی اور اچانک ظلم کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ حسینؑ اتفاقیہ طور پر مصائب کا نشانہ نہیں بنے تھے۔ حسینؑ کی مظلومیت کسی انجان مصیبت کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ اس اقدام کے لیے ظلم والے بہت دور سے منصوبہ بنا رہے تھے اور مظلومیت کا علمبردار ہر منصوبہ کو ناکام بنانے کے لیے اس سے زیادہ دور سے انتظام کر رہا تھا۔ یزید کی نگاہیں اتنی دور رس

نہیں ہو سکتی تھیں جتنی دور رس نگاہیں فرزندِ رسول الثقلین کی تھیں۔ یزید یہی سمجھ رہا تھا کہ اچانک بیعت کا مطالبہ اور اس کے ساتھ قتل کی دھمکی حسینؑ کے ہوش اڑا دے گی۔ اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکیں گے لیکن حسینؑ اپنی امامت کی نگاہ سے اس پورے مستقبل کا جائزہ لے رہے تھے جہاں تک یزیدی نگاہوں کی رسائی نہیں تھی۔ امام حسینؑ نے فیصلہ کیا کہ مجھے ظلم کا مقابلہ مظلومیت سے کرنا ہے لیکن اس اہتمام کے ساتھ کہ مظلومیت کو بیچارگی اور بے بسی کا نام نہ ملنے پائے۔ مجھے مظلومیت میں اصلاحی تعلیمات اور انسانی زندگی کا وہ رنگ بھر دینا ہے جو میرے ساتھ میرے مقصد کو اور مقصد کے ساتھ میری یاد کو صبح قیامت تک زندہ رکھ سکے۔ آج حسینؑ بھی زندہ ہیں اور حسینؑ کا مقصد بھی زندہ ہے۔ یزید مٹ گیا اور اس کا مقصد بھی فنا ہو گیا۔

۔ اہلِ نظر اس حیرت میں پڑے ہوئے ہیں کہ حسینؑ نے اپنے مقصد کو زندہ رکھا یا مقصد کی بلندی نے حسینؑ کو زندہ رکھا۔

یزید نے اپنے مقصد کو مٹایا یا مقصد کی گندگی نے یزید کو فنا کر دیا۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ مقصد کو شخصیت کی فنا و بقا سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور اس روشنی میں یہ کہنا آسان ہے کہ فرد میں خلوص اور مقصد میں بلندی ہوتی ہے تو فرد مقصد کی حفاظت کرتا ہے اور مقصد فرد کی نگہداشت میں مصروف رہتا ہے۔

حسینؑ آج ساری دنیائے انسانیت کے جانے پہچانے رہنما ہیں اس کا راز یہی ہے کہ دنیا کے ایک طبقہ نے حسینؑ کو ان کے مقصد سے پہچانا ہے

تو دوسرے طبقہ نے حسینؑ کے مقصد کو اُن کی شخصیت و مظلومیت سے اور یہ حسینی انداز نظر کا امتیاز ہے کہ دنیا ذات کو بات اور شخصیت کو مقصد سے جُدا نہیں کر سکی اور نہ کر سکتی ہے۔

شخصیت اور مقصد کا یہی اتحاد تھا جس کی طرف قرآن حکیم نے ان لفظوں میں اشارہ کیا تھا "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ" محمدؐ صرف اللہ کے رسولؐ ہیں۔ اُن کی شخصیت کا کوئی رُخ اور اُن کی ذات کا کوئی پہلو رسالت سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ زندہ ہیں تو رسول ہیں اور انتقال کر جائیں یا شہید ہو جائیں تو بھی رسول ہی رہیں گے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج مرسل اعظمؐ کو دنیا چھوڑے ہوئے چودہ سو برس کے قریب ہو گئے ہیں لیکن ہر گلدستہ اذان سے ایک ہی آواز آرہی ہے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ ـــــ ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمدؐ آج بھی اللہ کے رسول ہیں۔

مقصد شخصیت کا جزء نہیں بنتا تو کبھی مقصد شخصیت سے پہلے فنا ہو جاتا ہے اور کبھی شخصیت مقصد سے پہلے ـــ لیکن جب دونوں ایک دوسرے کے جزء بن جاتے ہیں تو اتنا اتحاد ہو جاتا ہے کہ کلمہ کا جزء لفظ محمدؐ بھی رہتا ہے اور لفظ رسول اللہ بھی ـــ اب نہ محمدؐ کا انکار ممکن ہے اور نہ رسالت کا ـ محمدؐ رسالت کے ذمہ دار کا نام ہے اور رسالت محمدؐ کے طریقۂ کار کا ـــ صلوات

سرکش طاقتیں ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتی ہیں کہ شخصیت کو

مقصد سے الگ کر دیا جائے تاکہ مقصد کو اپنے سانچے میں ڈھالا جا سکے۔ لیکن خالقِ کائنات نے قرآنِ حکیم کو قلبِ پیغمبرؐ پر اُتار کر کفر کو مایوس کر دیا، اور مرسلِ اعظمؐ نے وقتِ آخر قرآن و اہلبیتؑ کے اتحاد کا اعلان کر کے نفاق کو مایوس کر دیا۔ اب زندگی کے کسی موڑ پر بھی مقصد کو شخصیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کردارِ آلِ محمدؐ لینا ہے تو قرآن کے دامن سے حاصل کرو اور قرآن لینا ہے تو آلِ محمدؐ کی ڈیوڑھی پر آؤ۔

شخصیت اور مقصد کے اتصال و انفصال کی متقابل کوشش کا نام ہے کربلا۔ یزید کا مقصد تھا کہ بنی ہاشم کو بدنام کر کے اسلام کو ان کے گھرانے سے نکال لے اور پھر اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال دے اور فرزندِ رسولؐ کی آواز تھی کہ اگر دینِ خدا میں استحکام میرے قتل کا محتاج ہے تو جان دے سکتا ہوں، لیکن اسلام کو کردارِ پیغمبرؐ سے الگ کر کے کردارِ یزید کا نام نہیں دے سکتا۔

یہ حسینی سیاست کا معجزہ تھا کہ حسینؑ نے یزید کو ایک ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا جہاں یزید، امام حسینؑ سے اپنی بیعت کے بغیر اپنے مشن کو نامکمل سمجھتا ہے اور اپنی حکومت کو اسلامی رنگ دینے کے لیے ساری کائنات میں صرف حسینؑ سے بیعت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ حسینؑ کی ذات اسلام سے اس قدر متحد ہے کہ حسینؑ کی تصدیق کے بغیر کوئی حکومت اسلامی نہیں کہی جا سکتی۔ کاش یہی بات دنیا کے دوسرے مسلمان بھی محسوس کر لیتے اور انھیں اندازہ ہو جاتا کہ جس حکومت کو حسینؑ کے گھر والوں نے ٹھوکر مار دی ہے وہ حکومت اسلامی نہیں ہو سکتی۔ اسلام حسینؑ

کے گھر کا پروردہ ہے اور حسینؑ کا گھرانہ اسلام کا حقیقی ترجمان و نگراں ہے۔

ع "اسلام ہی کا اسمِ گرامی حسینؑ ہے"

۲۸ رجب کی رات تھی جب یزیدیت نے اپنی مہم کا پہلا قدم اُٹھایا اور یزید کے گورنر نے امام حسینؑ کو راتوں رات دربار میں طلب کر لیا۔ ابنِ زبیر جیسے کمزور نفس افراد نے راہِ فرار اختیار کی لیکن حسینؑ علیؑ کے لال حسینؑ ــــ فاتحِ خیبر کے فرزند حسینؑ ــــ فاتحِ دربارِ ظلم کے نورِ نظر حسینؑ نے یہ طے کر لیا کہ مجھے دربار میں جانا ہے اور ولید سے باقاعدہ فیصلہ کن گفتگو کرنا ہے۔ یہ عزم کر کے بیت الشرف میں تشریف لائے بہن کو پیغام سُنایا۔ بہن نے ارادہ دریافت کیا۔ امام حسینؑ نے فرمایا "بہن میں دربارِ ولید میں جا رہا ہوں، دیکھوں اس کا مقصد کیا ہے۔

بہن کا دل تڑپ گیا۔ عرض کی۔ ماں جائے! میں آپؑ کو اکیلے نہ جانے دوں گی ــــ اگر جانا ہی ہے تو اپنے ساتھ میرے شیر عباسؑ کو لے جائیے، میرے لال اکبرؑ کو لے جائیے، ہاشمی جوانوں کو لے جائیے تاکہ زینبؑ کے دل کو اطمینان رہے کہ میرا بھیّا اکیلا نہیں ہے۔ اس کی پُشت پر میرے شیروں کی ایک فوج ہے۔ جاں نثاروں اور غلاموں کا ایک لشکر ہے۔

یہ کہکر ہاشمی جوانوں کو طلب کیا، اور سب کو تیار کر کے بھائی کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اور فرمایا، میرے ہاشمی جوانو! میرے دل کے ٹکڑو! یہ خیال رکھنا کہ میرا ماںجایا پہلے پہل مجھ سے جُدا ہو کر جا رہا ہے۔ دیکھو! میرے بھیّا پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

میں نہیں جانتا کہ زینبؑ نے بنی ہاشم کے جوانوں سے کیا کہا۔
تاریخ کے اوراق بھی خاموش ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ زینبؑ کے جذبات ان تمام ہدایات کی طرف متوجہ کر رہے ہوں گے جو ایک بہن اپنے بھائی کی حفاظت کے لیے کر سکتی ہے۔

امام حسینؑ دربار کی طرف چلے۔ زینبؑ کا لشکر ساتھ ساتھ چلا۔ دربار تک پہونچے۔ ہاشمی جوانوں کو دروازہ پر روکا۔ خود دربار میں داخل ہوئے۔ ولید نے احترام سے بٹھایا۔ مرگِ معاویہ کی خبر سنائی۔ حسینؑ نے اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے کلمۂ اِنَّا لِلّٰہ زبان پر جاری کیا۔
بنی اُمیہ کے نمک خواروں کا بیان ہے کہ امام حسینؑ نے اس موقع پر حاکمِ شام کے لیے دعائے رحم و کرم بھی کی لیکن یہ بات انتہائی نامعقول اور ناممکن ہے۔ کلمۂ اِنَّا لِلّٰہ اسلامی تعلیم اور ہاشمی اخلاق ہے لیکن ظالم بادشاہ کے لیے دعائے رحم و کرم کرنا کسی اسلام کی تعلیم نہیں ہے بھلا حسینؑ اس کے لیے کیا دعائے رحم و کرم کریں گے جس کی سازش نے انھیں یتیم بنایا ہے۔ جس کے زہر نے اُن کے بھائی کے جگر کے بہتّر ٹکڑے کیے ہیں اور جس کے بنائے ہوئے حاکم نے آج بیعت کا مطالبہ کیا ہے۔ (اَلْعِیاذُ بِاللّٰہ)
خبرِ وفات کے ساتھ ولید نے یزید کا پیغام سُنایا۔ حسینؑ آپ کو بیعت کرنا ہوگی۔

آپؑ نے فرمایا ' یہ اہم مسائل پردۂ شب کی تاریکی میں نہیں طے ہوتے کل دربار میں مجھے بُلانا میں اُس وقت گفتگو کر کے یہ واضح کروں گا کہ بیعت

کا حقیقی حقدار کون ہے اور بیعت کسے کرنا چاہیے۔
امام حسین علیہ السّلام کی منطقی گفتگو نے ولید کو مطمئن کردیا اور اُس نے آپؑ کو رخصت کردیا، لیکن مروان بول پڑا۔
ولید! اگر آج حسینؑ بچ کر نکل گئے تو پھر ہاتھ نہیں آئیں گے۔ بہتر ہے کہ ان سے بیعت لے لے، یا ان کا سر قلم کرلے۔
یہ سُننا تھا کہ فاتحِ خیبر کے لال کو جلال آگیا، اور فرمایا: او زنِ نیلگوں چشم کے بچے ۔۔۔! تو مجھے قتل سے ڈرا رہا ہے؟ کس کی مجال ہے جو میری طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکے۔
امامؑ کی آواز کا بلند ہونا تھا کہ ہاشمی جوان دربار میں داخل ہوگئے۔ آگے آگے تلوار لیے ہوئے قمرِ بنی ہاشمؑ ۔۔۔ چہرہ غصّہ سے سرخ، تیوریاں چڑھی ہوئی حیدرِ کرّارؑ کا جلال نمایاں۔ خبردار! ولید، اب مولا کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہونے پائے۔

ولید بدحواس ہوگیا۔ فرزندِ رسولؐ نے بھائی کو روک دیا۔
بس بھیّا عباسؑ بس! میرے بھائی یہ وقتِ جہاد نہیں ہے۔
مولا کا حکم ملا، عباسؑ نے تلوار نیام میں رکھی اور ہاشمی جوانوں کے حلقے میں مولا کو لے کر بیت الشّرف تک آئے۔
جیسے ہی ثانیٔ زہراؑ نے بھائی کو دیکھا، دوڑ کر ماںجائے سے لپٹ گئیں۔
ارے میرے بھیّا آپؑ واپس آگئے ۔۔۔؟
زینبؑ کو سخت اضطراب تھا، دیکھیں، کیا گذرتی ہے۔ امّاں کی یادگار!

آپؑ واپس آ گئے ؟

توزینبؑ کا دل ٹھہر گیا۔ کیوں نہ ہو۔ میرا عباسؑ ساتھ تھا، میرے ہاشمی جوان ہمراہ تھے۔

عزادارانِ حسینؑ ! جی چاہتا ہے عرض کروں۔ شہزادی ! آج جب بھائی دربار کیلئے گئے تو آپؑ نے ایک پورا ہاشمی لشکر ساتھ کر دیا۔

لیکن کل جب عصرِ عاشور آپ کا ماںجایا مقتل میں جائے گا تو کیا کیجئے گا ؟ کون ساتھ جائے گا۔ کون رکاب تھامے گا۔ کون گھوڑے پر سوار کرے گا ؟ اُس وقت نہ قاسمؑ ہونگے، نہ عونؑ و محمدؑ، نہ علی اکبرؑ ہوں گے، نہ عباسؑ۔

عجب نہیں شہزادی جواب دیں۔ جب کوئی نہ ہوگا تو زینبؑ اپنے بھیا کو رخصت کرے گی۔ زینبؑ خبر گیری کیلئے میدان میں جائے گی۔ "زینبؑ آواز دیگی او لپسرِ سعد لعین میرا ماںجایا ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔

عزیزو ! جو زینبؑ نے دل میں طے کیا تھا وہی کیا۔ جب حسینؑ اکیلے رخصت ہونے لگے تو درِ خیمہ پر آکر بازو تھام کر گھوڑے پر سوار کیا اور جب گھوڑے سے گرے تو گھبرا کر میدان میں آ گئیں اور وہ منظر دیکھا جو خدا کسی بہن کو نہ دکھلائے۔ ہائے وہ حسینؑ کا سجدۂ آخر، وہ شمر کا خنجر اور وہ زینبؑ کی فریاد۔

حسینؑ نے اشارہ کیا۔ زینبؑ خیمہ کی طرف لوٹیں، زمینِ کربلا ہلی، فضا میں آواز گونجی اَلَا قُتِلَ الحُسَینُ بِکَربلا ، اَلَا ذُبِحَ الحُسَینُ بِکَربلا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ

۲

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ •

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰی اَعْدَآئِهِمْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی فِیْ کِتَابِهِ الْکَرِیْمِ • "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ"۔

قرآنِ حکیم نے حضور سرورِ کائنات کا تعارف ان مختصر الفاظ میں کرایا ہے کہ " وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ " محمدؐ کچھ نہیں ہیں یہ صرف اللہ کے رسولؐ ہیں۔ ان کی رسالت بھی کوئی نئی چیز نہیں ہے جسے تم نہ سمجھ سکتے ہو۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں تمھیں رسالت کے معنی بھی معلوم ہیں، تم رسول کی حیثیت اور عظمت سے بھی باخبر ہو۔ اور تمھیں ان قوموں کے حالات بھی معلوم ہیں جنھوں نے اپنے دور کے رسولوں کا انکار کیا اور دنیا و آخرت کا خسارہ اٹھایا۔

انسان جب دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اپنے ہمراہ بیشمار مادی اور

دنیاوی تعلقات لیکر آتا ہے۔ یہ تعلقات کبھی رشتوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور کبھی دوسرے عنوان سے دکھائی دیتے ہیں۔

آنے والا بچہ ایک ماں باپ کا بیٹا ہوتا ہے تو ایک بہن یا بھائی کا بھائی ایک دادا کا پوتا ہے تو ایک نانا کا نواسہ ایک چچا کا بھتیجا ہوتا ہے تو ایک ماموں کا بھانجا۔

خون کے ان رشتوں کے علاوہ کچھ اور تعلقات بھی ہوتے ہیں کہ وہ ایک ملک کا باشندہ ہوتا ہے تو ایک زبان کا خوگر۔ ایک قوم کی فرد ہوتا ہے تو ایک قبیلہ کا رکن۔ ایک وطن کا رہنے والا ہوتا ہے تو ایک جماعت کا ممبر۔ اس کے بعد جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے زندگی کی ضروریات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ حیات مختلف ترقی کی منزلوں سے گذرنے لگتی ہے۔ اور ہر منزل کے ساتھ ایک نئے رشتے کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ استاد کا شاگرد بنتا ہے کبھی شاگرد کا استاد۔ کبھی دفتر کا ملازم بنتا ہے کبھی ملازموں کا حاکم۔ کبھی زوجہ کا شوہر ہوتا ہے کبھی بچوں کا باپ۔ غرض زندگی کے ہر موڑ پر ایک نئے رشتے کا اضافہ ہوتا ہے اور حیاتِ چند روزہ کا ہر لمحہ ایک نئی ذمہ داری لے کر آتا ہے۔

زندگی کے ان ہی اعتبارات کے ساتھ اس کے نام اور عنوان بھی بدلتے جاتے ہیں۔ وہ ایک نام قوم کے اعتبار سے پاتا ہے تو ایک ملک کے اعتبار سے۔ ایک عنوان وطن سے حاصل کرتا ہے تو ایک قبیلہ سے۔ لیکن.....

مادیت کے یہ رشتے اس وقت مضمحل اور کمزور ہونے لگتے ہیں جب انسان

روحانی ترقیوں کی منزلوں میں قدم رکھتا ہے۔ وہ قوم اور قبیلہ کا فرد اسی وقت تک شمار ہوتا ہے جب تک اس کی عوامی حیثیت نہیں ہوتی۔ عوامی حیثیت حاصل کر لینے کے بعد وہ سارے عنوان خود بخود بدل جاتے ہیں۔

انسان ابتدائی زندگی میں ایک گھرانہ اور خاندان کی ملکیت ہوتا ہے اور درجۂ کمال پر فائز ہونے کے بعد پوری قوم کی ملکیت بن جاتا ہے گھر میں جلنے والی روشنی گھر والوں کی ملکیت ہے لیکن آفتاب عالمتاب پوری دنیا کے لیے ہے۔ حوض میں جمع ہونے والا پانی ایک گھر کی ملکیت ہے لیکن سمندر پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اصولِ فطرت نے ہی انسان کو یہ سکھا دیا ہے کہ محدود شخصیت محدود افراد کے لیے ہوا کرتی ہے اور شخصیت کا پھیلاؤ اس کی ہمہ گیری کا سبب بن جاتا ہے۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ بڑی حیثیت پیدا کر لینے کے بعد انسان کی ابتدائی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تو غیر ممکن ہے۔ انسان قوم و قبیلہ وطن و زبان کے شکنجوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ شکنجے اس کی پھیلی ہوئی شخصیت کو اپنے گھیرے میں لینے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ آپ نے برابر تجربہ کیا ہو گا کہ پانی ابتدائی منزلوں میں رکنے کے لائق ہوتا ہے لیکن سیلاب بن جانے کے بعد کسی گھیراؤ (رکاوٹ) کو قبول نہیں کرتا۔ یہی حیثیت عالمی شخصیتوں کی ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنے کمالات کی بنا پر ان منزلوں پر پہونچ جاتے ہیں، جہاں چھوٹے چھوٹے بندھوں کا گذر نہیں ہوتا، اور شخصیت کی

ہمہ گیری ان بندھوں کو تحت الشعاع میں ڈال دیتی ہے۔

ایک سیاسی رہنما کسی وطن و خاندان کی ملکیت نہیں ہے۔ وہ ایک پوری قوم کی متاعِ بے بہا ہے۔ ایک ڈاکٹر کسی قبیلے و نسل کی جاگیر نہیں ہے بلکہ پوری قوم کا سرمایہ ہے۔ ایک عالمِ دین کسی رنگ و نسب کا پابند نہیں ہے بلکہ پوری دنیائے مذہب کا سرمایۂ افتخار ہے۔

شخصیت کا پھیلاؤ اس کے ابتدائی رشتوں کو کمزور اور اس کے مادی تعلقات کو ناقابلِ توجہ بنا دیا کرتا ہے۔ سرکار سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی شخصیت کی ہمہ گیری اور آفاقیت کا راز بھی یہی ہے کہ حسینؑ کمالات کی اُن منزلوں پر ہیں جہاں قوم و ملت رنگ و نسل، قبیلہ و خاندان کے شکنجوں کی رسائی نہیں ہے۔ حسینؑ کی عظمت تک خود دنیائے انسانیت کی بھی رسائی نہیں ہے۔

یہ سوچنا غلط ہے کہ حسینؑ کو ساری دنیائے انسانیت کا شہید بنا دیا جائے تو ان کی عظمت کو چار چاند لگ جائیں گے اور وہ ملک و ملت، قبیلہ و قوم کے شکنجوں سے آزاد ہو کر بین الاقوامی شخصیت بن جائیں گے۔ ان کی شان یہ ہوگی کہ صرف ایک قوم نہیں بلکہ "ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ"۔

یہ تصورِ عظمت حسینؑ کے نہ پہچاننے ہی سے پیدا ہوا ہے۔ حسینؑ کی ذات جس طرح قوم و ملت میں اسیر نہیں کی جاسکتی اسی طرح ان کی عظمت کردار کو انسانیت کے محدود تصورات کا پابند نہیں بنایا جاسکتا۔ حسینؑ اس بلندی پر ہیں جہاں انسانیت تو انسانیت کل کائنات کی رسائی نہیں ہے۔

دنیا نے حسینؑ کے رشتے کو انسانیت سے جوڑا ہے اور خود حسینؑ نے اپنے رشتے کو خدا سے جوڑا ہے۔ انسانیت ایک محدود تصوّر ہے اور خدا ایک لامحدود ہستی۔ محدود سے رشتہ شخصیت کو محدود بنا دیتا ہے، اور لامحدود سے تعلق عظمت و بلندی کی حد بندیوں کو توڑ کر شخصیت کو ابدی اور سرمدی بنا دیا کرتا ہے۔

دنیا نے امام حسین علیہ السلام کی اس عظمت کو پہچان لیا ہے تو قرآن مجید کے اس فقرے کا سمجھنا بہت آسان ہے جسے میں نے عنوانِ کلام قرار دیا ہے اور رسُلِ اعظمؐ کی اس حیثیت کا اندازہ آسان ہے جسے میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حسینؑ اپنے نانا کی عظمت کا آئینہ ہیں حسینؑ کردار پیغمبرؐ کی تصویر ہیں حسینؑ بلندئ رسالت کے سمجھنے کا پیمانہ ہیں جس نے حسینؑ کو نہیں پہچانا وہ پیغمبرؐ کو بھی نہیں پہچان سکا۔

قرآن حکیم نے مرسلِ اعظمؐ کی اسی عظمت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میرا حبیبؐ اپنے وجودِ ظاہری کے ساتھ بیشمار رشتے لیکر آیا ہے اس کے ساتھ قوم کا رشتہ بھی ہے اور خاندان کا بھی۔ یہ زبان کا رشتہ بھی رکھتا ہے اور وطن کا بھی۔ اسے مکّی کہنا بھی درست ہے اور مدنی بھی۔ یہ عربی بھی ہے اور ہاشمی بھی۔ لیکن اپنے کمالات کی بناء پر عظمت و جلالت کی اُس منزل پر ہے جہاں ان معمولی رشتوں کی رسائی نہیں ہے۔ اسے رشتوں میں محدود کرنا اس کی عظمت کی توہین ہے۔ اسے پہچاننا ہو تو یوں پہچانو...

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ" (محمد صرف اللہ کا رسولؐ ہے)

اس کا رشتہ خدا سے اتنا گہرا اور مستحکم ہے کہ باقی رشتے ماند پڑ گئے ہیں اور ان کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے۔ اس کی معرفت یہ نہیں ہے، کہ اسے مکہ، مدینہ، عرب اور ہاشمیت سے پہچانو اس کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ اسے خدا کے ذریعہ اور خدا کو اس کے ذریعہ پہچانو۔ اسی لیے قرآنِ حکیم نے وضاحت کردی تھی کہ "میرے حبیبؐ! آپؐ یوں کہیئے کہ میری نماز میری عبادتیں میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔"

میں قوم وملّت کی خدمت بھی خدا ہی کے لیے کرتا ہوں اور قبیلہ و خاندان سے اُنس و اُلفت بھی اُسی کے لیے رکھتا ہوں۔ وہ کسی کو اپنا بنا لیتا ہے۔ میں اہلبیتؑ میں شامل کرلیتا ہوں۔ وہ کسی پر غضبناک ہوجاتا ہے تو میں بھری محفل سے اُٹھادیتا ہوں۔

ناواقف ہیں وہ افراد جو مجھے مکّہ و مدینہ سے پہچاننا چاہتے ہیں اور نااہل ہیں وہ انسان جو زلف و رخسار کو میری عظمت کا پیمانہ سمجھتے ہیں میری عظمت کا صرف ایک پیمانہ ہے اور اس کا نام ہے رسالت۔ میں قوم و ملّت کا ہوجاتا تو دنیا کے شکنجوں میں گرفتار ہوکر رہ جاتا۔ میں نے اپنے کو وطن و خاندان کے لیے وقف کردیا ہوتا تو اس کے ساتھ فنا ہوجاتا۔

میں نے اپنی زندگی کو مالک کی بندگی کے لیے وقف کردیا ہے میری ہستی صرف ربّ العٰلمین کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے

دنیا کا کوئی شکنجہ گرفتار نہیں کر سکتا۔ محدودیت کی کوئی زنجیر میری شخصیت کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی اور انسانیت کی کوئی کمند میری بلندی تک نہیں پہونچ سکتی۔

میری منزل معراج کی رات معلوم ہوئی ہے جب ساری کائنات میرے زیرِ قدم تھی اور عرشِ اعظم میری جوتیوں کے نیچے آگیا تھا۔ اُس دن دنیا کو معلوم ہوا کہ دنیا والوں کی رسائی کہاں تک ہے اور اللہ والوں کی عظمت کی انتہا کہاں تک ہے۔

یہ معراج کی رات کوئی مکی، مدنی نہیں جا رہا تھا۔ یہ عرش کی بلندیاں کسی عربی یا ہاشمی کے زیرِ قدم نہیں تھیں۔ یہ سماوات عبداللہ کے فرزند اور عبدالمطلب کے پوتے کے قدم نہیں چوم رہے تھے۔ یہ ملائکۂ آسمان، قاسم و طاہر کے باپ کا استقبال نہیں کر رہے تھے۔

یہ عبدیّت کی معراج تھی جہاں عبد جانے والا تھا اور معبود ملنے والا۔ بندگی سجدہ گہ کی تلاش میں تھی اور الوہیّت مسجدِ اقصیٰ کی نشاندہی کر رہی تھی۔

دنیا پہچان سکے تو پہچانے کہ عظمت کا معیار قوم و قبیلہ نہیں ہے عظمت کا معیار تو عبودیت اور بندگی ہے۔ معراج کے تذکروں پر سر دُھننے والے سمجھ سکیں تو سمجھیں کہ قابَ قوسَین تک محمدیّت نہیں گئی تھی، بلکہ عبدیّت نے سیر کی تھی۔ اب عظمتِ رسولؐ کا اندازہ کرنا ہے تو محمدیّت کے رشتوں کو نظر میں نہیں لانا ہوگا، بلکہ عبدیّت اور رسالت کے رشتوں پر غور

کرنا ہوگا۔

ممکن ہے کوئی انسان یہ سوچے کہ معراج میں تو عبدیّت کا ذکر ہے رسالت سے کیا واسطہ، رسالت اور ہے اور عبدیّت اور۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ رسالت کی عظمت کیا ہے۔ عبدیّت سے اس کا کیا تعلّق ہے لیکن میں پہلے تو یہ عرض کروں گا کہ رسالت' عبدیّت ہی کے عظیم درجہ کا نام ہے عبدیّت جتنی بڑھتی جائے گی رسالت کے مراتب میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

کیا آپ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی لفظیں نہیں سُنیں:

"اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰـنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ" (سورۂ مریم آیت ۳۰)

(میں اللہ کا بندہ ہوں اُس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے)

یعنی عیسٰیؑ نے عبدیّت ہی کو نبوّت کی تمہید بنایا ہے۔ عیسٰیؑ کی عبدیّت انھیں نبوّت تک لے گئی اور مرسلِ اعظمؐ کی عبدیّت نے اُن کے فرقِ اقدس پر ختمِ نبوت کا تاج رکھ دیا۔

اس کے علاوہ ایک نکتہ یہ بھی ہے ..... کہ معراج میں عبدیّت اور رسالت دونوں کا تذکرہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عبدیّت جانے میں کام آئی ہے اور رسالت آنے میں کام آئی ہے۔

عبدیّت نے اپنی روحانی اور معنوی ترقی کی بنا پر قابِ قوسین تک پہونچایا اور رسالت نے وہاں بھی ذمّہ داریوں کا حامل بنایا عبدیّت کے تذکرے کے بعد معراج کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مالکِ کائنات

نے اعلان کیا۔

"لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ط" (بنی اسرائیل آیت ۱)

(اس معراج کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے بندے کو اپنی نشانیاں دکھلانا چاہتے ہیں۔)

خدا ہی جانے کہ اُس نے کیا نشانیاں دکھلائیں اور صاحبِ معراج ہی جانے کہ اُس نے کیا دیکھا۔ ہاں قرآن میں ایک فقرہ محفوظ رہ گیا

"اَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ط" (والنجم آیت ۱۰)

(اُس نے جو کچھ چاہا اپنے بندے کو (وحی کے ذریعہ) اشاروں ہی اشاروں میں سمجھا دیا۔)

تاریخ اِس صیغۂ راز کی تلاش میں تھی۔ ایک مرتبہ غدیرِ خم کے میدان نے آواز دی۔ "اے میرے رسولؐ! اسے پہونچا دو جو تمھاری طرف نازل کیا جا چکا ہے۔"

نبیؐ نے قافلے کو روک کر علیؑ کی ولایت کا اعلان کیا اور شبِ معراج نے آواز دی۔ "لو معراج کا پردہ اُٹھ گیا اور کل جو بات صیغۂ راز میں تھی آج عالم میں آشکارہ ہو گئی۔

اعلانِ غدیر میں "يَآ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ" کا لفظ گواہ ہے کہ معراج کی رات عبدیّت، رسالت کا مخصوص پیغام لینے کے لیے قابِ قوسین کی منزلوں تک گئی تھی عبدیّت اپنا کام کر رہی تھی اور رسالت اپنے فرائض کا انتظار کر رہی تھی۔

عبدیت کا یہی وہ ارتقاء ہے اور " دَنَا فَتَدَلّٰی " کا یہی وہ مزاج ہے جس نے فرزندِ رسولؐ کو معراجِ شہادت تک پہونچنے کے لیے آمادہ کیا۔ اور حسینؑ نے ایک سجدۂ آخری کے لیے یہ اہتمام کیا کہ نانا کا وطن چھوڑ دیا۔ اللہ کے حرم سے جدائی برداشت کرلی اور کربلا کے میدان تک آ گئے۔

نبیؐ کا سفرِ معراج راتوں رات ہوا تھا اور حسینؑ نے اپنا سفر دن دہاڑے شروع کیا۔ رات کی تاریکی میں نانا کے روضے سے رُخصت ہوئے، ماں کی لحد کو الوداع کہا۔ بھائی کی قبر کو آخری سلام کیا اور صبح ہوتے ہوتے سارے خاندان کو آمادۂ سفر کرلیا۔ جو باقی رہ گئے انھیں

رخصت کرنے کا اہتمام کیا۔ سب سے پہلے اپنی نانی اُمِ سلمہ کی خدمت میں آئے۔ نانی اماں! اپنے حسینؑ کا سلام لیجیے۔

جناب اُمِ سلمہ نے تڑپ کر پوچھا، میرے لال ارادہ کیا ہے؟

کہا، نانی، عراق جا رہا ہوں۔

عراق کا نام سُننا تھا کہ اُمِ سلمہ کا دل دہل گیا۔ بیٹا! عراق ــ عراق ــ میرے حسینؑ! یہ عراق کا نام کیوں لیا۔ عراق کا ارادہ کیوں کرلیا؟ عراق والوں نے تمھارے باپ اور بھائی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ اب تم کیوں عراق جا رہے ہو؟ حسینؑ! پہلے اپنے نانا سے تو رخصت لے لو۔

آواز آئی نانی اماں! یہ حکم میرے نانا ہی نے دیا ہے۔ نانا نے

فرمایا ہے۔ حسینؑ ! کربلا جاؤ۔ میرے لال ! سر کٹاؤ، اور میرے دین کو بچاؤ۔ اُم سلمہ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

اَرے میرے لال ! کوئی یوں بھی اپنے مرنے کی خبر سُناتا ہے ــــ بیٹا ! تو مجھے کیوں رُلوا رہا ہے، میرے لال۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری خبر کیسے ملے گی، تمہارے سفر کے حالات کیسے معلوم ہوں گے ؟

امام حسینؑ نے کہا، نانی اماں، میں آپ کو ایک جگہ دکھلانا چاہتا ہوں نانی اماں نے بصد اشتیاق آنکھیں کھولیں۔ نواسے نے اشارہ کیا۔ عالم کی زمینیں پست ہوئیں کربلا کی زمین بلند ہوئی۔

حسینؑ نے اشارہ کیا۔ نانی جان ! آپ اس نشیب کو دیکھ رہی ہیں۔ ؟

اُم سلمہ نے غور سے دیکھا، حسینؑ نے کہا، نانی اماں ! یہی وہ جگہ ہے جہاں آپ کے حسینؑ کا گلا کاٹا جائے گا۔ یہیں آپ کا لال شہید ہوگا۔ یہیں پنجتن کی آخری تصویر خاک میں ملائی جائے گی۔ یہیں فاطمہؑ کا باغ اُجڑے گا اور نبیؐ کا گلستان خزاں کی نذر ہو جائے گا۔

اُم سلمہ نے آنسوؤں کو روک کر غور سے اپنے لال کے مقتل کو دیکھا۔ دل نے تڑپ کر آواز دی۔ اُم سلمہ ! دیکھ لو، اب حسینؑ پھر نہ ملیں گے۔ اب یہ تصویر پھر نہ دیکھنے میں آئے گی۔ اب یہ حسینؑ پھر پلٹ کر نہ آئے گا۔

نانی نے جی بھر کر نواسے کو دیکھا۔ دل کو سنبھال کر پوچھا، بیٹا ! یہ تو بتاؤ

یہ واقعہ کب پیش آئے گا اور مجھے اس واقعے کی خبر کیوں کر ہوگی ؟

امام حسینؑ نے ہاتھ بڑھا کر ایک مٹھی خاکِ کربلا اُٹھائی اور جناب اُمِ سلمہ کے حوالے کر دی۔ نانی اماں ! آپ اس خاک پر نظر رکھیں جب تک یہ خاک، خاک رہے، سمجھیں کہ آپ کا حسینؑ زندہ ہے اور جب یہ خاک خون میں تبدیل ہو جائے، سمجھیں آپ کا حسینؑ مارا گیا۔

حسینؑ مدینہ چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ مکہ آئے، اور مکہ سے رخصت ہو کر کربلا پہونچے۔

اِدھر جناب اُمِ سلمہ کا دستور یہ ہے کہ جب دل گھبراتا ہے اور حسینؑ کی یاد تڑپاتی ہے تو گھبرا کر اُس شیشے کو دیکھ لیتی ہیں۔ خاک کو بشکلِ خاک پا کر دل ہی دل میں دُعا دیتی ہیں۔ اللہ! میرے حسینؑ کو سلامت رکھے۔ اللہ! میرے لال کو دشمنوں سے بچائے۔ میرے مالک! تیرا شکر ہے ابھی فاطمہؑ کا لال زندہ ہے۔ ابھی میرا حسینؑ بخیریت ہے۔

وقت گذرتا رہا، حالات بدلتے رہے۔ محرم کا چاند فلک پر نمودار ہوا، اب اُمِ سلمہ کا دل برابر دھڑکنے لگا۔ اِدھر حسینؑ کے بچوں پر پانی بند ہوا، اِدھر اُمِ سلمہ کا دل تڑپا۔ ادھر حسینؑ نرغۂ اعدا میں گھرے ادھر ام سلمہ کے اضطراب میں اضافہ ہوا۔ ادھر حسینؑ عاشور سے قریب تر ہوتے رہے اِدھر اُمِ سلمہ کی الجھنیں بڑھتی رہیں اور جب الجھنیں پیدا ہوں، دوڑ کر جائیں اور شیشی کو دیکھ لیں۔ دل ٹھہر جائے۔

یہاں تک کہ عاشور محرم کا دن آیا۔ آج اُمِ سلمہ کو صبح سے قرار نہیں۔

بار بار شیشی کو دیکھتی ہیں اور حسینؑ کی سلامتی کی دعائیں کرتی ہیں۔ ایک مرتبہ ظہر کے بعد ام سلمہ بستر پر لیٹ گئیں، شدتِ اضطراب میں آنکھ لگ گئی۔ دیکھا رسولِ اکرمؐ سامنے کھڑے ہیں، عالم یہ ہے کہ سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں آستینیں الٹی ہوئی ہیں، بالوں پر خاک پڑی ہوئی ہے۔

گھبرا کر پوچھا۔ خدا کے رسولؐ! یہ آپ کا کیا عالم ہے؟

فرمایا، ام سلمہ! تم سو رہی ہو۔ میں لٹ گیا، میرا حسینؑ مار ڈالا گیا۔ ام سلمہ! میرا گھر اجڑ گیا۔ ام سلمہ! کربلا میں سب شہید ہو گئے۔ ذرا غور سے تو دیکھو، یہ میرے سر پر خاک کیسی ہے، یہ میرے بال کیوں بکھرے ہیں، یہ میں نے آستینیں کیوں الٹی ہیں؟ ام سلمہ! میں صبح سے کربلا کے میدان میں تھا میں نے اپنے حسینؑ کا گلا کٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے اپنے لال کو زیرِ خنجر تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ ام سلمہ! یہ میرے سر پر کربلا کی خاک ہے اور میرے بدن پر حسینؑ کے خون کی چھینٹیں ہیں۔

عزادارو! یہ سننا تھا کہ ام سلمہ تڑپ گئیں، گھبرا کر آنکھ کھولی تو جناب رسولِ اکرمؐ تو نظر نہ آئے لیکن زبان پر یہ فقرے جاری ہو گئے۔

"وامحمّداہ واعلیاہ واحسیناہ واثمرۃ فواداہ"

ارے میرے لال! ارے میرے حسینؑ!

میری زہراؑ کے جائے تو کربلا میں شہید ہو گیا۔ میرے حسینؑ! تجھے دشمنوں نے قتل کر ڈالا۔ کاش کوئی ہوتا تو میرے حسینؑ کو خنجرِ قاتل سے بچا لیتا۔ کاش کوئی ہوتا جو وقتِ آخر ایک قطرۂ آب دے دیتا۔ مگر افسوس کہ کسی

کو میرے حسینؑ پر رحم نہ آیا، کسی نے نہ سوچا کہ میرا حسین رسول اللہؐ کی گود کا پالا ہے اسے زہراؑ نے بڑی مشقتوں سے پالا ہے، اس کے لیے جنّت سے لباس آیا تھا، آسمان سے نعمتیں آئی تھیں اور آج وہی حسینؑ ایک ایک قطرۂ آب کو ترسایا گیا۔ ہائے یہ آسمان گر کیوں نہیں پڑا، یہ زمین تباہ کیوں نہیں ہو گئی، یہ کائنات باقی کیسے رہ گئی جب زہراؑ کی کائنات اُجڑ گئی اور پیغمبرؐ کا باغ کٹ گیا۔

میں کہوں گا بی بی! آپ تعجب نہ کریں۔ کائنات میں انقلاب آیا ہے زمین ہلی ہے، آسمان سے خون برسا ہے، آفتاب کو گہن لگا ہے، سیاہ آندھیاں چلی ہیں، مگر ظالم شمر کو رحم نہ آیا اور اُس نے اپنا خنجر چلا دیا۔

انّا للہ و انّا الیہ راجعون

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

۳

أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ●

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللهِ عَلٰی اَعْدَآئِهِمْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللهُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِهِ الْکَرِیْمِ

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ"

ارشادِ جناب ربّ العزّت ہے : "اور محمدؐ صرف میرے رسولؐ ہیں" میرے رشتے کے بعد کسی دنیاوی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ میرا ہے میرا، میرے علاوہ کسی کا کچھ نہیں ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ جب رسول اکرمؐ کی زندگی میں ہر انسان کی طرح بیشمار پہلو پائے جاتے ہیں اور آپؐ کی حیاتِ طیّبہ بھی مختلف رشتوں میں اسیر ہے۔ تو مالکِ کائنات کے اِس ارشاد کا مطلب کیا ہے۔ اِس سلسلے میں

مختلف اوقات میں مختلف توجیہات بیان کی جاچکی ہیں۔ آج ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ مرسلِ اعظمؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو قابلِ انکار نہیں ہے۔ آپؐ انسان ہیں تو انسانی زندگی کے تمام تعلّقات بھی رکھتے ہوں گے، لیکن دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب کسی مال پر کسی کارخانے کی مُہر اور اُس کی چھاپ نہیں ہوتی تو خریدار کو مال کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ اور اس کا مادّہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اُس کی ساخت و پرداخت پر نظر کرنا پڑتی ہے لیکن جب معتبر کارخانے کی مُہر یا چھاپ مل جاتی ہے تو مادّہ نظر انداز کردیا جاتا ہے اور کارخانے کے اعتبار پر سودا کرلیا جاتا ہے۔ اب اگر مال خراب بھی ہوگا تو بیچنے والے سے کوئی باز پرس نہ ہوگی، بلکہ اُس کارخانے کے مالک سے بات کی جائے گی جس نے اُس مال کو بنایا ہے اور اُس پر اپنی مُہر لگا کر گارنٹی کارڈ ایجاد کیا ہے۔

اُس مُہر اور چھاپ کا ایک فائدہ مال کے اعتبار اور عدمِ اعتبار کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ بھی پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ مال کس کارخانے کا ہے اس کی ساخت پرداخت کس ملک میں ہوئی ہے اور اس کی ضمانت اور گارنٹی کا اعتبار کتنا ہے۔

کمپنیاں اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے اتنی ہی ضمانت دیتی ہیں جتنا اُنھیں اپنے مال پر اعتبار ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مال میں بقا کی صلاحیت دو سال کی ہو اور ضمانت دس برس کی دے دی جائے اور نتیجہ میں ساری کمپنی بدنام ہو جائے اور اُسے دنیا کی نگاہوں میں بے اعتبار قرار دے دیا جائے۔

ضمانت کا اصول بھی یہ ہے کہ ضمانت زبانی نہیں ہوتی بلکہ ایک تحریر کی شکل میں ہوتی ہے جسے خریدار اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے تاکہ وقتِ ضرورت کارخانے کے مالک کو دکھا کر اُس سے یہ مطالبہ کر سکے کہ آپ نے دس سال کی ضمانت کا کارڈ دیا تھا اور یہ مال دو ہی سال میں خراب ہو گیا۔

مثال کے مادّی خصوصیات کو الگ کرنے کے بعد سرکارِ دو عالمؐ کی دونوں حیثیتوں کا سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ آپ بیک وقت مکّی، مدنی عربی اور ہاشمی بھی ہیں اور اللہ کے نبیؐ و رسول بھی۔ لیکن مالکِ کائنات نے تمام حیثیتوں کو نظر انداز کر کے صرف رسالت کو باقی رکھا ہے۔

بتانا یہ ہے کہ اس چھاپ کو دیکھنے کے بعد مادّی حیثیتوں پر نظر کرنا خلافِ عقل و انصاف ہے۔ اب تم یہ نہ دیکھو کہ یہ عبداللہ کا فرزند ہے، مکّہ کے گھروں میں پیدا ہوا ہے، ہاشمی گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، عربی زبان میں کلام کرتا ہے۔ بلکہ صرف یہ دیکھو کہ یہ ہمارا رسول ہے، ہمارا نمائندہ ہے، ہمارا فرستادہ ہے، ہمارے دستِ قدرت کا سنوارا ہوا ہے۔ اس کی ذات اس کے صفات اور اُس کے کردار پر ہماری چھاپ ہے۔ اسے ہم نے اپنا بنا لیا ہے اسے ہم نے اپنی ذات کے ساتھ مخصوص کر لیا ہے۔

اب اگر اس میں حُسن ہے تو ہمارا ہے اور تمھاری نظر میں کوئی برائی ہے تو اُس کی نہیں وہ بھی ہماری ہی ہے۔ اب تمھاری عقل اور تمھاری سمجھ ہے کہ تم ہماری مخصوص صنعت میں عیب نکال سکو۔

یاد رکھو! دنیا میں ہر صنّاع اپنی صنعت کی ضمانت لیتا ہے۔ میں نے

بھی اپنی صنعتِ خاص کی ضمانت لی ہے۔ یہ کوئی بے عقل مصنوع نہیں ہے کہ اس کی مادّی پائیداری کی ضمانت لی جائے۔ یہ صاحبِ عقل و ہوش ہے۔ یہ صاحبِ فکر و نظر ہے۔ اس لیے میں نے اس کے جسم کی بقا کی بھی ضمانت لی ہے اور اس کے فکر و نظر کی سلامتی کی بھی ضمانت لی ہے۔ اہلِ دنیا ظلم و جور کا نشانہ نہ بنائیں تو اس کے جسم میں ضعف نہیں آسکتا اور ساری دنیا مل کر اس کی فکر و نظر پر حملہ کرنا چاہے تو اسے مجروح نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ جسم تک اہلِ دنیا کی رسائی ہے، وہ اسے مجروح اور زخمی بنا سکتے ہیں اور روح تک کسی کی رسائی نہیں ہے اس کا براہِ راست ہم سے رابطہ ہے۔

تم نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اپنے حبیبؐ کے کردار کی ضمانت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

دنیا کے انسان، دو قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کے قول ہی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ دن بھر مہمل باتیں کیا کرتے ہیں اور بے ربط دعووں میں دل کو بہلایا کرتے ہیں۔ اور کچھ وہ ہوتے ہیں جو مقامِ قول میں صداقت و دیانت سے کام لیتے ہیں لیکن منزلِ عمل میں اُن کے قدم میں لغزش آجاتی ہے۔

ہم نے اپنے حبیبؐ کے کردار کی ضمانت میں دونوں باتوں پر نظر رکھی ہے قول کی ضمانت لی ہے تو اعلان کر دیا ہے:۔

"وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى"

(سورہ والنجم آیات ۳-۴)

اور کردار کی ضمانت لی تو صاف کہہ دیا:

"وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی"

"میرے حبیبؐ! یہ سنگریزے تم نے نہیں پھینکے ہیں، یہ سنگریزے (ہم) اللہ نے پھینکے ہیں۔"

نبیؐ کا قول ہمارا قول ہے، نبیؐ کا فعل ہمارا فعل ہے، نبیؐ کا عمل ہمارا عمل ہے، نبیؐ کی رفتار و گفتار ہماری رفتار و گفتار ہے۔ خبردار! میرے حبیب کے کردار پر کوئی اعتراض نہ کرنا۔ اب یہ اس کا کردار نہیں ہے یہ ہمارے اشارۂ وحی کے نمونے ہیں جو اس کی زندگی میں ظاہر ہو رہے ہیں وہ کسی کی تعریف کر رہا ہے تو گویا ہم کر رہے ہیں۔ وہ کسی کی مذمت کر رہا ہے تو گویا ہم کر رہے ہیں۔ وہ کسی کو اپنے کاندھے پر بٹھا رہا ہے تو وہ بھی ہمارا ہی عمل ہے اور کسی کو محفل سے اٹھا رہا ہے تو وہ بھی ہمارا ہی اشارہ ہے۔

دل چاہتا ہے کہ عرض کروں میرے مالک دنیا کے صنّاع جب اپنے مال کی ضمانت لیتے ہیں تو ایک گارنٹی کارڈ بھی دیتے ہیں تاکہ اگر کبھی مال میں کوئی عیب نظر آئے یا کوئی نقص پیدا ہو جائے تو اُس کارڈ کو دکھلا کر مالک سے محاسبہ کر سکیں تو نے اپنی صنعتِ خاص کی ضمانت کے بارے میں کیا انتظام کیا ہے۔ تیری ضمانت کا ثبوت کیا ہے۔

عجب نہیں قدرت جواب دے۔ تو نے غور نہیں کیا میں نے اپنی صنعت پر مختلف مُہریں لگا دی ہیں۔ اس کے دوام و استحکام کی مختلف نشانیاں مقرر کر دی ہیں۔ دیکھ اس کی پشت پر نبوّت کی مُہر ہے اس کی انگلیوں پر شق القمر کی مُہر ہے۔ اُس کے قدم پر منزلِ قوسین کی مُہر ہے اور اُس کے

ہاتھوں پر سنگریزوں کے تسبیح کی مہر ہے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ایک ضمانت کی کتاب بھی ہے جس کا نام ہے قرآن۔ یہ خود رہے یا نہ رہے، یہ قرآن تمھارے درمیان رہے گا اور چیلنج بن کر رہے گا۔ اب سے لیکر صبح قیامت تک، جب بھی نبوّت کے کردار میں کوئی خرابی یا کمزوری نکل آئے، یہ قرآن میرے پاس لیکر آجانا، میں دیکھوں گا کہ تم نے میری صنعت میں کیا عیب نکالا ہے اور میرے حبیبؐ کا کردار کتنا طیّب و طاہر ہے۔

یاد رکھیے، دنیا کے کارخانوں کی طرف سے جو گارنٹی ٹک ملتی ہے، اُس میں ضمانت کی میعاد لکھی رہتی ہے۔ اس وقفہ کے درمیان مال میں عیب نکل آئے تو درست بھی ہو سکتا ہے، بدلا بھی جا سکتا ہے، اصلاح بھی ممکن ہے لیکن اس کے بعد کوئی ذمّہ داری نہیں ہوتی اور وہ گارنٹی ٹک بیکار تصوّر کی جاتی ہے۔

مالک کائنات کی ضمانت کا اندازہ اس سے بالکل مختلف ہے اس نے کردارِ رسولؐ کی ابدی اور دائمی ضمانت لی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ نبیؐ کو اُٹھایا، لیکن قرآن کو نہیں اُٹھایا، تاکہ مجھ پر ایمان رکھنے والوں کے پاس ایک دائمی سند رہے کہ میرے حبیبؐ کا کردار کتنا طیّب و طاہر اور پاک و پاکیزہ ہے

عزیزانِ محترم! دنیا کا اصول ہے کہ جب کسی مال پر کارخانے کی مہر لگ جاتی ہے تو اربابِ عقل و دانش مادّہ کو نہیں دیکھا کرتے بلکہ کارخانہ کے اعتماد پر سودا کیا کرتے ہیں۔ مادّی اسباب کا تجزیہ کارخانے کی ضمانت کے

کھُلی ہوئی توہین تصوّر کیا جاتا ہے۔

مالکِ کائنات بھی یہی سمجھانا چاہتا ہے کہ جب تک میں نے اپنی ضمانت کا اعلان نہیں کیا تھا تمھیں حق تھا، تم اس کی خِلقت پر نظر کرتے اس کے خاندان کو دیکھتے۔ اس کے قوم و قبیلے کا جائزہ لیتے، لیکن جب ہم نے ضمانت لے لی تو اب تمھیں کسی بات پر نظر رکھنے کا حق نہیں ہے۔ اب تو صرف ہم پر اعتبار کا سودا ہے اور بس۔!

یہاں تک آنے کے بعد میں دنیائے اسلام سے کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم میں "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ" کا اعلان نہ ہوتا تو تم رسولؐ کی بشری زندگی کا جائزہ لیتے، اس میں عیب نکالتے، ان کی صلح پر اعتراض کرتے، ان کی جنگ پر جرح کرتے، ان کی تعلیم پر انگلیاں اُٹھاتے، ان کے اخلاق کو نشانۂ اعتراض بناتے۔ اُن کے جسم میں بُرائی تلاش کرتے، ان کی عقل پر ہذیان کا شبہ کرتے۔ لیکن جب ربّ العالمین نے ضمانت لے لی تو اب تمھیں کسی اعتراض کا حق نہیں ہے۔ اب تو صرف خدا پر بھروسہ کرنا پڑے گا اور اگر اعتراض کا شوق پیدا ہو، تجزیہ کی ہوس پیدا ہو تو یاد رکھنا کہ یہ نبیؐ کی صلح و جنگ پر اعتراض نہیں ہے، یہ خدا کی صلح و جنگ پر اعتراض ہے۔ یہ رسولِ اکرمؐ کے دماغ پر حملہ نہیں ہے، یہ مرکزِ وحیٔ الٰہی پر حملہ ہے۔

یاد رکھو! کہ نبیؐ پر حملہ کر کے تو اسلام بچا بھی لے جاتے لیکن خدا پر حملہ کر کے اسلام نہیں بچ سکتا۔ اس لیے کہ بشریت کا پہلو نبوّت کی زندگی میں تراشا جا سکتا ہے، وحیٔ الٰہی میں بشریت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

بشریت اور نبوّت کے امتیاز کا تحفظ ہی تھا جس نے سرکار سیّد الشہدا کو مدینہ چھوڑ کر کربلا جانے پر مجبور کر دیا۔ یزید دنیا کو یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ محمدؐ بھی ایک انسان تھے، اُن کے پہلو میں بھی انسانی دل تھا۔ اُن کے دل میں بھی انسانی خواہشات کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ انھوں نے یہ سب کچھ ملک گیری کی ہوس میں کیا تھا۔ ان کا ڈھونگ مال و دولتِ دنیا کے لیے تھا۔ رسالت کوئی شے نہیں ہے۔ وحی کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ صرف قوم پر حکومت کا ایک جذبہ تھا جس نے ان الفاظ کے تراشنے پر آمادہ کیا تھا اور فرزندِ رسول الثقلینؑ اپنی قربانی سے اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتے تھے کہ جس کے دل میں حکمرانی کا جذبہ ہوتا ہے، جو قوم کی گردنوں پر سوار ہونا چاہتا ہے، جو اپنے دل میں ملک و مال کی ہوس رکھتا ہے، وہ جان لینا جانتا ہے۔ جان دینا نہیں جانتا اور میں جان دینے کے لیے آمادہ ہوا ہوں تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ جس نبیؐ کا نواسہ اور جس رسولؐ کا وارث تخت و تاج کی ہوس سے بے نیاز ہو وہ رسولؐ کتنا پاکیزہ کردار ہوگا۔

حسین ابنِ علی علیہما الصّلوٰۃ والسّلام کا تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ عورتوں اور بچّوں کو لیکر کربلا کی طرف نکل جانا کھُلا ہوا اعلان تھا کہ ہوسِ حکومت والے اِس انداز سے نہیں نکلا کرتے۔ دولت کے طلب گار تنہا ایک مسلم کو کوفہ نہیں بھیجا کرتے۔ ملک حاصل کرنے والے عورتوں اور بچّوں کو لیکر صحراؤں کا سفر نہیں کیا کرتے۔ لڑائی کی تیاری کرنے والے فوجِ دشمن کو پانی نہیں پلایا کرتے۔ جنگ پر آمادہ ہونے والے دشمن کو دیکھ کر نہر کا کنارا نہیں

چھوڑا کرتے۔ لیکن میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں، تاکہ دنیا پہچان لے کہ حکومت والوں کا انداز اور ہوتا ہے اور رسالت والوں کا انداز اور۔ جنگ کرنے کے اسباب اور ہوتے ہیں اور جہاد کرنے کے سلیقے اور۔ حکومت والے فوجوں پر فوجیں طلب کرتے ہیں اور رسالت والے چراغ بجھا کر ساتھیوں کو رخصت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ جنگ والے سپاہیوں کو جمع کرتے ہیں اور جہاد والے چھ مہینے کے بچے کو میدان میں لاتے ہیں۔

دین و مذہب کے تحفّظ کا یہی جذبہ لیے ہوئے امام حسین علیہ السلام دوسری محرم کو صحرائے کربلا میں وارد ہو گئے۔ راستے میں حُر کے لشکر نے روکا آپ نے حُر کو سمجھایا لیکن لشکر نے ماننے سے انکار کر دیا آپ نے حُر کے رسالے کو پیاسے انسانوں اور جانوروں کو سیر کیا۔ لیکن اس کے باوجود دشمنوں کو رحم نہ آیا صرف ایک حُر کا دل تھا جو بار بار پیچ رہا تھا لیکن ابھی عزائم میں وہ پختگی نہیں آئی تھی کہ دولت و حکومت کو ٹھوکر مار کر چلا آتا۔ ابھی حُر انھیں منزلوں میں ہے کہ امام کے سامنے نمازِ جماعت قائم نہیں کرتا، بلکہ خود امام حسین علیہ السلام کی اقتدا میں نماز ادا کرتا ہے۔ حسینؑ کی اقتدا اور لشکرِ ابنِ زیاد کی سرداری۔ یہ کیسے ممکن ہے۔؟

یہ خیال آنا تھا کہ حُر نے بڑھتے ہوئے امام حسین علیہ السلام کے گھوڑے کی لجام پر ہاتھ ڈال دیا۔

فرزندِ رسولؐ کو جلال آگیا۔ فرمایا: حُر! تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے یہ کیا کر رہا ہے۔؟

اصحاب غصے میں بھرے ہوئے اس منظر کو دیکھ رہے تھے، لیکن امام حسین علیہ السلام نے کوئی اقدام نہیں فرمایا، صرف ایک مؤثر فقرہ ارشاد فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حُر نے دبی آواز میں عرض کی:

فاطمہؑ کے لال! اگر آپ کی مادرِ گرامی فاطمہؑ زہرا نہ ہوتیں تو میں بھی جواب دیتا لیکن کیا کروں دخترِ رسولؐ کی شان میں گستاخی نہیں کرسکتا۔

قافلہ آگے بڑھ گیا، لیکن حُر کے دل میں یہ کھٹک رہ گئی حسینؑ فرزندِ فاطمہؑ ہیں حسینؑ کا خون بہانے کا مطلب فرزندِ فاطمہؑ کا خون بہانا ہے۔ حسینؑ پر پانی بند کرنے کا مطلب ساقیٔ کوثر کے لال کو پیاسا رکھنا ہے۔ یہی جذبہ تھا جس نے شبِ عاشور حُر کو بیدار کردیا اور صبح ہوتے ہوتے حُرؑ امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گیا۔

چلا تو اس انداز سے چلا کہ فوجِ دشمن کو امام حسین علیہ السلام کی پیاس یاد دلا کے چلا۔

ایک سپاہی سے پوچھا تو نے اپنے گھوڑے کو پانی پلا لیا ہے۔؟

اُس نے کہا ہم برابر پانی پلا رہے ہیں، گرمی کی شدت سے جانور بیتاب ہو رہے ہیں۔

حُر نے ایک آہِ سرد کھینچی۔ اللہ! فوجِ یزید کے جانور سیراب ہوں اور ساقیٔ کوثر کی اولاد پیاسی رہے۔

یہ کہہ کر آگے بڑھے گھوڑے پر سوار ہوئے، گھوڑے کو ایڑ لگائی تیزی سے بڑھے تھے کہ بیٹے نے آواز دی۔ باپ نے مڑ کر پوچھا کیا ارادہ ہے؟

کہا، آپ کے ساتھ قربان ہونے کا عزم ہے۔

بیٹے کو ساتھ لیا۔ امامؑ کی خدمت میں پہنچے۔ اصحاب نے استقبال کیا حُر نے دوڑ کر سر امامؑ کے قدموں پہ رکھ دیا۔ فرزندِ رسولؐ! کیا خطا معاف ہوگی؟

امام حسین علیہ السلام نے فرمایا، حُر، قدموں سے سر اُٹھا لے۔ حُر، فرزندِ فاطمہؑ کو شرمندہ نہ کر۔

حُر نے کہا مولا! جب تک میری خطا معاف نہ ہوگی، یہ سر نہ اُٹھے گا۔

امامؑ نے فرمایا، اے حُر! میں نے تیری خطا کو معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا۔ حُر! اب تو سر اُٹھا لے۔

حُر نے عرض کی مولا! مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے آپ کا راستہ

میں نے ہی روکا تھا۔ آپؑ کے سامنے یہ مصائب میری ہی وجہ سے آئے ہیں۔ آقا، سوچتا ہوں کہ اگر آج میں نے راستہ نہ روکا ہوتا تو آپؑ اس بَلا کے بن میں کیوں آتے؟ اگر آپؑ نے میرے لشکر کو سیراب نہ کر دیا ہوتا تو آپؑ کے بچے العطش العطش کی آوازیں کیوں بلند کرتے۔

حُر کا ایک ایک موئے بدن سرکار سیّد الشّہداؑ سے التماس کر رہا تھا۔ مولا، مرنے کی اجازت دیجیے۔

حُر کے مسلسل اصرار پر امام حسین علیہ السلام تو کچھ نہ کہہ سکے، البتہ ہاشمی غیرت نے آواز دی۔ حُر! یہ کیا کہہ رہا ہے؟ ارے کوئی مہمان کو مرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ بیکسی نے فریاد کی حُر! فرزندِ رسولؐ شرمندہ ہے کہ تیری کوئی خاطر نہ کر سکا، اب مرنے کا نام لے رہا ہے۔

حُر کا ضمیر برابر اصرار کرتا رہا۔ اور آخر کار اجازت نہ ملنے پر حُر نے آواز دی۔ فاطمہؑ کے لال! علیؑ کے نورِ نظر! اے کریم ابنِ کریم! کیا غلام کی کوئی بات نہ مانیں گے؟

فرزندِ رسولؐ نے فرمایا: حُر! اور کیا کہنا چاہتا ہے۔؟

حُر نے ہاتھ جوڑے، عرض کی، آقا! اگر مجھے مرنے کی رضا نہیں دیتے تو میرے بیٹے ہی کو جانے دیجیے۔

اربابِ غیرت سوچیں، حسینؑ کے دل پر کیا گذر گئی ہوگی۔ اور مظلومیت کا کیا عالم ہوگا کہ حُر جوان بیٹے کو مرنے کی اجازت دلوا رہے ہیں۔

فرزندِ رسولؐ نے سر جھکا کر فرمایا، حُر! اگر تیری یہی مرضی ہے تو جا میں نے اجازت دی۔

حُر کے چہرے پر بشاشت کے آثار دوڑ گئے، مسکرا کر بیٹے کو گلے سے لگایا، سر پر عمامہ باندھا، زرہ پہنائی، کمر سے تلوار لگائی، گھوڑے پر سوار کیا اور کہا، جا میرے لال خدا حافظ۔ بیٹا! جلتے ہو تو گلا کٹوا دینا۔ میرے لال! آج تیری شہادت سے تیرا باپ فاطمہؑ کے لال کے سامنے سُرخرو ہوگا۔

بیٹا، باپ کو آخری سلام کر کے چلا، میدان میں آیا۔ جہاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ دشمن میں جوشِ انتقام اُبھرا۔ ایک آواز آئی۔

یہ ابھی اِدھر سے لوٹ کر گیا تھا، اس نے لشکرِ یزید کی ساکھ خراب کی ہے، اس نے ہماری فوج سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ اسے چاروں

طرف سے گھیر لیا جائے اور اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں

حُرؑ کا فرزند یہ ساری آوازیں سُنتا رہا اور نہایت بے جگری کے ساتھ مصروفِ کارزار رہا۔ آخر کار جب زخموں سے چُور ہو کر گھوڑے سے گرنے لگا تو باپ کو آواز دی۔

بابا آئیے! غلام آپ کا آخری دیدار کر لے۔

حُرؑ کے کانوں میں آواز آئی۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کمر کو کس کے باندھا اور میدان کا رُخ کیا۔ فرزندِ رسولؐ کو خبر ملی۔

فرمایا، حُر! تیرا کیا ارادہ ہے۔؟

حُر نے کہا، آقا، بیٹے نے یاد کیا ہے۔ اس کے سرہانے جا رہا ہوں

یہ سُنتے ہی فرزندِ رسولؐ کا دل تڑپ گیا آواز دی حُر! یہ کیا غضب کر رہا ہے۔؟ ارے میرے وفادار شیر! یہ کیا ارادہ کر لیا ہے۔ حُر! کیا اپنے سامنے جوان بیٹے کو ایڑیاں رگڑتے ہوئے دیکھے گا۔؟

حکمِ امام سے مجبور حُر نے دل کو سنبھالا، قدموں کو روکا، کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ فرزندِ رسولؐ اصحاب کے ساتھ بڑھے۔ حُر کے جوان کا لاشہ اُٹھایا۔

دل چاہتا ہے عرض کروں، فاطمہؑ کے لال! کربلا کے مظلوم مسافر! حُرؑ اپنے جوان کو ایڑیاں رگڑتے ہوئے نہ دیکھے گا، حُرؑ اپنے جوان کا لاشہ نہ اُٹھائے گا۔ لیکن مولا! اُس وقت کیا کیجیے گا جب علی اکبرؑ کا آخری وقت ہو گا۔ جوان کا سر آپؑ کے زانو پر ہو گا۔ بیٹا ایڑیاں رگڑ رہا ہو گا

۴

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ•

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ•

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى اَعْدَآئِهِمْ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ الْحَكِيْمُ فِيْ كِتَابِهِ الْكَرِيْمِ

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ"

حضرت ربّ العزّت اپنے حبیبؐ کی عظمت وجلالت کا اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرما رہا ہے۔ "اور محمدؐ صرف میرا رسول ہے" اور بس۔ رسالت کے علاوہ اس کی زندگی میں اور کسی پہلو کا تلاش کرنا اس کی عظمت سے ناواقفیّت کی دلیل ہے۔ یہ میرا ہے اور صرف میرا ہے میرے علاوہ اس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے اور جو رشتہ ہے اس پر میرے

رشتے کی چھاپ ہے۔ یہ پہلے میرا ہے اس کے بعد کسی اور کا ہے اور جس کا بھی ہے میرے ہی رشتے سے ہے۔ مجھ سے رشتہ توڑنے کے بعد کوئی اس سے رشتہ قائم کرلے، یہ ناممکن ہے۔ اور اس کی رسالت کا سہارا لیے بغیر کوئی مجھ تک پہونچ جائے یہ بھی ناممکن ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ اس حقیقت کا اعلان ان لفظوں میں بھی ہو سکتا تھا جن لفظوں میں ہم عام طور سے حضور سرورِ کائنات کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں اور قرآن مجید نے بھی دوسرے مقام پر تذکرہ کیا ہے۔ یعنی

"مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ" (سورۂ فتح)

لیکن نہ جانے کیا مصلحتِ الٰہی ہے کہ اُس نے اس مقام پر رسولؐ کی رسالت کا اعلان کرنے کے بجائے رسالت کے حصر کا اعلان کیا ہے اور یہ نہیں کہا کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، بلکہ یہ اعلان کیا کہ محمدؐ صرف اللہ کے رسولؐ ہیں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

اس نکتہ کا اندازہ کرنے کے لیے پہلے یہ سوچنا پڑے گا کہ ان دونوں لہجوں کا فرق کیا ہے اور عرب کس مقام پر کس لہجہ کو اختیار کرتے ہیں۔

آپ عربی زبان کا جائزہ لیتے چلے جائیے، آپ کو یہ بات محسوس ہو جائے گی کہ عرب جب بھی کسی بات پر زور دینا چاہتے ہیں اور اس کی غیر معمولی عظمت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو وہاں یہی لہجہ اختیار کیا جاتا ہے۔

زید کو عالم کہنا بھی اس کے علم کا اعلان ہے اور صرف عالم کہنا بھی لیکن فرق یہ ہے کہ عالم ہونے کے ساتھ دوسرے حالات و کیفیات کا

احتمال رہ جاتا ہے جو علمی زندگی کو مشکوک و مشتبہ اور کمزور بنا دیتا ہے۔ لیکن صرف عالم ہونے کے بعد ایسا کوئی امکان نہیں رہ جاتا اور اب یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر پہلو علمی ہے۔ یہ اُٹھتا ہے تو عالمانہ انداز سے، بیٹھتا ہے تو عالمانہ طریقے سے، سوچتا ہے تو عالمانہ رنگ میں اور بات کرتا ہے تو عالمانہ لہجے میں۔

قرآن حکیم نے بھی قدم قدم پر اشیاء کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے یہی لہجہ اختیار کیا ہے۔ یہ بات تو بہت آسان ہے کہ ہم نے انسان کو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے لیکن یہ بات بہت بلند ہے کہ ہم نے اس کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ بندگی کے لیے پیدا کرنے میں غیر بندگی کا امکان پایا جاتا ہے۔ لیکن صرف بندگی کے لیے پیدا کرنے میں ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔

سرکارِ دو عالمؐ نے بھی مالکِ کائنات کی عظمت کا تعارف کراتے ہوئے مکّہ کی گلیوں میں جو نعرہ بلند کیا تھا وہ اسی لہجہ میں تھا۔ آپؐ نے یہ نہیں کہا کہ خدا کو موجود یا ایک مانو۔ بلکہ آپؐ کا مطالبہ یہ تھا کہ سوائے خدا کے کسی کو خدا نہ مانو۔ خدا کو ایک ماننا اور سوائے خدا کے کسی کو خدا نہ ماننا۔ بظاہر ایک ہی چیز ہے لیکن اس میں ایک ذہنی تربیت کا نکتہ ہے جس کے بغیر اسلام اپنی تربیت میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

خدا کو ایک ماننے کا عقیدہ خدا کی طرف متوجّہ تو کر سکتا ہے اس کی عظمت کے سامنے سرِ تسلیم جھکا سکتا ہے۔ اس کی بارگاہِ نیاز میں سجدہ

کر سکتا ہے لیکن غیرِ خدا کے سامنے سر بلند نہیں کر سکتا۔ اسلام یہی چاہتا ہے کہ بندہ اپنی زندگی اس درمیانی راستے سے گذارے کہ بندوں کا سامنا ہو تو سرفراز و سر بلند ہو جائے اور مالک کی بارگاہِ نیاز میں آ جائے تو سجدہ میں سر جھکا دے۔

ذہن پر عقیدۂ ربوبیت کا بار بھی رہے اور دل و دماغ غیر کی بندگی سے آزاد بھی ہو جائیں۔ دماغ کو سکون بھی مل جائے اور دل سر بسجدہ بھی ہو جائے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی تراش و خراش اور اس کے لہجہ و انداز نے ذہنِ مسلم کو نظریات و افکار کی اس بلندی تک پہونچا دیا ہے جہاں خدا کے علاوہ کوئی چیز ذہن میں سماتی ہی نہیں ہے وہ کائنات کی جس شے پر نظر ڈالتا ہے لَا اِلٰہَ کی صفت میں اپنے برابر ہی پاتا ہے۔ شمس و قمر ارض و سما، لیل و نہار، دشت و جبل، انسان و حیوان کوئی ایسا نہیں ہے جس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے اور اس کی خدائی کا اقرار کیا جائے وہ پہاڑوں کی بلندی کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لَا اِلٰہَ دریاؤں کی روانی کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لَا اِلٰہَ، لیل و نہار کی آمد و رفت کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لَا اِلٰہَ، شمس و قمر کی تابانیوں کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لَا اِلٰہَ کوئی خدا نہیں ہے اور جب ان میں کوئی خدا نہیں ہے تو، نہ اُن سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ اُن کے مقابلے میں احساسِ کمتری کا شکار ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ اپنی تمام قوتوں، ذخیروں اور رعنائیوں کے ساتھ اُس

خدا کی مخلوقات ہیں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے کہ انھیں عقل و خرد سے محروم رکھا ہے اور مجھے عقل کی بلندیوں سے بہرہ ور کیا ہے۔ یہ اپنا دردِ دل سُنا نہیں سکتے اور میں ماجرائے زندگی بیان کر سکتا ہوں۔ یہ بندگی کے احساس سے بھی محروم ہیں اور مجھ میں عبد و معبود کے رشتے باقی ہیں۔

یاد رکھیے جس لہجہ و انداز میں مرسلِ اعظمؐ نے رب العالمین کی عظمت کا اعلان کیا ہے۔ اسی لہجہ میں مالکِ کائنات نے اپنے حبیبؐ کی پاکیزہ سیرت کا تعارف کرایا ہے۔ اب اس کی زندگی میں رسالت کے علاوہ کوئی پہلو تلاش نہ کرنا۔ یہ رسولؐ ہے اور صرف رسول ہے اور میرا رسولؐ ہے۔

اتنا فرق ضرور ہے کہ میری حیات کوئی مادّی حیات نہ تھی، میرا رشتہ مادّی رشتہ نہیں تھا، میری زندگی زبان و مکان اور جسم و جسمانیات سے بالاتر تھی۔ میں "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ" حیثیت کا مالک تھا اس لیے میری زندگی اور میرے افعال میں مختلف حیثیتیں نہیں نکالی جا سکتی تھیں۔ میرے دشمنوں نے میری عظمت کو گھٹانے کے لیے کفر و شرک کا پہلو نکالا، کبھی میرے وجود ہی کا انکار کر دیا گیا اور کبھی میرے مقابلے میں دوسرے خدا لا کر کھڑے کر دیے گئے۔ اب میرے رسولؐ کا فرض تھا کہ وہ میری عظمت کا اعلان کرتے ہوئے میری توحید کا تحفّظ کرے اور یہ بتائے کہ مجھ جیسا کوئی دوسرا خدا ممکن نہیں ہے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور پتھر کھا کر، کانٹوں پر چل کر، لہو میں نہا کر، مصائب اُٹھا کر ایک ایک

گلی اور ایک ایک کوچہ میں اعلان کر دیا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ وہ کائنات کا خالق و مالک ہے اور سب اسی کی مخلوق ہیں، اور رسولؐ کی زندگی سیکڑوں مادّی رشتوں میں گرفتار تھی اس کی زندگی کے بارے میں شرک کے امکانات بیشمار تھے۔ اس کے کردار کو متعدد جہتوں سے مشکوک بنایا جاسکتا تھا اس کے اعمال کے تقدّس پر بیشمار اعتراض کے پہلو نکالے جاسکتے تھے اور میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے علاوہ دوسرا نبی نہیں ہے۔ میں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے ہیں۔ میں نے آدمؑ سے لیکر خاتم تک مرسلین کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے۔ میں نے ہر دَور میں ہدایت کا ایک معقول انتظام کیا ہے۔ میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نبی نہیں ہے۔ اور نہ دوسرے کے نبی ہونے سے میرے نبی کی عظمت پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔ میرے علاوہ دوسرا خدا ہو جائے تو ساری خدائی باطل و بیکار ہو جائے۔ نبی کے علاوہ دوسرے نبی ہیں۔ اور ان کی نبوّت و رسالت پر کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ سیّد المرسلین بھی ہیں اور خاتم النّبیّین بھی، وہ نمائندۂ الٰہی بھی ہیں اور صاحبِ کتاب و شریعت بھی۔ دشمن نے بھی ان کے بارے میں دوسرے انبیاءؑ کے عقیدے کو ان کی توہین و تذلیل کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بلکہ کھلے ہوئے دشمنوں نے سرے سے ان کی نبوّت کا انکار کیا:۔

"وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا۔"

اے میرے حبیبؐ ! کفار یہ" کہتے ہیں کہ آپؐ (ہمارے) رسولؐ نہیں ہیں ۔"

اور چھپے ہوئے منافق دشمن نے اس کی زندگی کی پاکیزگی اور اس کے کردار کی عظمت کو مجروح بنایا۔ اب میرا فرض ہے کہ میں دونوں طرف پہرے بٹھا کر اس کی عظمت کا تحفظ کروں اور ہر جہت سے اُس کے کردار کو پاکیزہ ثابت کروں ۔ میں نے ایک لفظ میں دونوں فرض ادا کر دیے ۔

" وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ "

لفظ رسول نے واضح کر دیا کہ یہ خدائی نمائندہ اور اس کا فرستادہ ہے اور نفی و اثبات کے لہجے نے ثابت کر دیا کہ اس کی زندگی میں رسالت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کا ہر عمل رسالت ہے اور اس کا ہر قدم رسالت ۔

یہاں تک آنے کے بعد ایک فقرہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اربابِ حکمت کا یہ اصول ہے کہ شخصیت پر جس رُخ سے اعتراض کیا جاتا ہے اسی رُخ سے جواب کا بھی انتظام کیا جاتا ہے اور شخصِ حکیم کا جواب خود اس بات کی دلیل بن جاتا ہے کہ اعتراض کس رُخ سے آیا ہے اور شُبہہ کس جہت سے پیدا کیا گیا ہے ۔ آپ کسی شخص کے علم پر زور دیں تو ہم بغیر بتائے یہ سمجھ لیں گے کہ لوگ اس کے علم میں شُبہہ کر رہے ہیں سخاوت میں نہیں۔ اور سخاوت پر زور دیں تو ہم سمجھ لیں گے کہ اس کی سخاوت مشکوک سمجھی جا رہی ہے علم نہیں۔

بعینہ یہی حال اربابِ حکمت کے لہجۂ کلام کا ہے کہ کلام کا لہجہ خود ہی

غمّازی کر دیتا ہے کہ اہلِ باطل کس رُخ سے شبہہ پیدا کر رہے ہیں اور بات کہاں سے کہاں جا رہی ہے۔

لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ دلیل ہے کہ دشمنِ خدا نے وحدانیت پر اعتراض کیا تھا اور مرسلِ اعظمؐ نے واضح کر دیا کہ دوسرے خدا کا تصوّر برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ خدا ایک ہے اور بس ایک۔ نہ دوسری کائنات ہے نہ دوسرا پیدا کرنے والا۔ نہ کوئی دوسرا نظام ہے اور نہ اس کا چلانے والا اور "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ" دلیل ہے کہ دشمنِ رسالت نے کردارِ نبیؐ پر حملہ کیا تھا، اور اس میں مختلف پہلو نکال کر کردار کے تقدّس کو مجروح کرنا چاہا تھا۔ اور خدائے کریم نے واضح کر دیا کہ یہ صرف رسول ہیں اب ان کی زندگی میں رسالت کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

اسی کی روشنی میں یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُحد کے میدان میں مسلمانوں کے فرار کے باوجود مولائے کائنات علی بن ابی طالب علیہ السّلام کے جہاد میں شبہہ کیا جا رہا تھا اور آگے چل کر یہ کہنے کا جواز نکالا جا رہا تھا کہ اُحد تنہا علی علیہ السّلام نے فتح نہیں کیا بلکہ اس میں ہمارا بھی ہاتھ ہے۔

زبانِ وحی سے بہتر اس سازش کو کون سمجھتا۔ اس نے روزِ اوّل ہی مسئلہ کو صاف کر دیا۔ "لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ" علیؑ کے علاوہ کوئی جوان نہیں ہے۔ اب نہ کہنا کہ دوسرے افراد بھی اُحد کے معرکے کو سر کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ میدان کو فتح کرنے کے لیے فتیٰ کی ضرورت ہے اور علی علیہ السّلام کے علاوہ کوئی فتیٰ نہیں ہے۔

ارباب کرم لہجہ کو لہجہ سے ملائیے تو کلام کا لطف سمجھ میں آئے گا۔

" لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ " وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے اور " لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ " (علی علیہ السّلام کے علاوہ کوئی جوان نہیں ہے۔)

اب نہ دوسرے خدا کا عقیدہ جائز ہے اور نہ دوسرے جوان کا تصوّر ماننا پڑے گا کہ جس طرح ایک خدا سے یہ کائنات چل رہی ہے ویسے ہی ایک علی علیہ السّلام سے جہاد کی فتح چل رہی تھی۔

میں نے عرض کیا کہ مرسلِ اعظمؐ کی حیات پر کفر و نفاق نے دُہرے حملے کیے۔ کُفر نے رسالت کا انکار کیا اور نفاق نے زندگی میں دوسرے گوشے

تلاش کیے اور یہی دونوں باتیں یزید کے ایک شعر میں نظر آتی ہیں : یعنی

(یہ سب بنی ہاشم کا کھیل ہے ، نہ کوئی وحی آئی ہے نہ خبر)

وحی اور خبر کا انکار کھلا ہوا رسالت کا انکار ہے۔ اور ہاشمیت کا حوالہ دلیل ہے کہ یزید، محمد مصطفےٰؐ کے پاکیزہ کردار کو ہاشمی اثرات کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ سرکار سیّد الشہداءؑ نے آواز دی۔ یزیدؑ ! سر کٹ جائے یہ ممکن ہے لیکن رسالت مٹ جائے یہ ناممکن ہے۔ اسلام بدنام ہو جائے، یہ غیر ممکن ہے۔ یزید ! تجھے نہیں معلوم کہ تو فوجوں کی کثرت میں کفر و اسلام کے معاملہ کو چھپا کر بنی ہاشم و بنی اُمیّہ کی جنگ کو جنگِ اقتدار بنانا چاہتا ہے اور میں غریب الوطن ہو کر کربلا کے جنگل میں گلا کٹا کر دنیا پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اقتدار کی جنگ کا نقشہ اور ہوتا ہے اور حق و حقّانیت کے بچانے

کا نقشہ اور۔

سرکارِ سیّد الشہداؑ نے یزید کی مہم کو ناکامیاب بنانے کے لیے جہاں اور انتظامات کیے وہاں ایک اہم انتظام یہ بھی کیا تھا کہ آپؑ نے تھوڑے سے آدمی اپنے ہمراہ لیے، لیکن مختلف قبیلوں سے لیے، مختلف خاندانوں سے لیے، مختلف جگہوں سے لیے، تاکہ جہادِ حق، جنگِ ملک گیری نہ بننے پائے، اور مجاہدینِ راہِ خدا کو اقتدار پرست نہ کہا جا سکے۔

اس سے بالاتر ایک انتظام یہ بھی تھا کہ حسینؑ نے اپنی مظلومیت کے سہارے مختلف مذاہب کے افراد کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ کبھی گروہِ باطل سے زہیرؑ کو نکالا، کبھی عیسائیت کے دامن سے وہبؑ کو نکالا، کبھی یزیدیت کی فوج سے حُرؑ کو نکالا، تاکہ آنے والی قومیں جب کبھی تاریخ پڑھیں تو انھیں یہ اندازہ رہے کہ ایک مذہب کے دوؔ بادشاہوں کی لڑائی میں دوسرے افراد اپنا مذہب چھوڑ کر ساتھ نہیں دیا کرتے اور دنیا کا کوئی صاحبِ عقل مظلوم کی ہمدردی میں اپنا دین نہیں چھوڑ دیا کرتا۔ یہ حسینی تدبیر تھی جس نے تاریخ کا منھ بند کر دیا اور الزام تراشنے والوں کی زبانوں پر قفل لگا دیے۔

اب نہ کہنا، یہ دوؔ بادشاہوں کی جنگ تھی۔ یہ دوؔ مسلمانوں کی لڑائی تھی۔ خبردار! میرے ساتھیوں کا کردار آواز دے رہا ہے کہ حسینؑ حفاظتِ حق کے لیے جہاد کر رہے تھے، حسینؑ بقائے اسلام کے لیے اُٹھے تھے۔ اِس لیے جب ہم نے مقصد کی بلندی کو پہچان لیا تو راحت و آرام کو ٹھوکر مار کر بیکس حسینؑ کے قدموں میں آ گئے۔ اور اپنی آسائش کا کوئی خیال نہیں کیا۔

اربابِ عزا ! اب ذرا سوچیں۔ کوئی انسان جس کی عمر جوانی کی عمر ہو نئی نئی شادی کی ہو اور دولہن کو رخصت کر کے اپنے گھر لے جا رہا ہو، اس کے جذبات، اس کی تمنّائیں اور اس کی اُمنگیں اِس بات کی اجازت دیتی ہیں کہ وہ اپنی لذّتِ حیات کو قربان کر کے ایک غریب الوطن کے ساتھ ہو جائے، اپنے نشاطِ زندگی کو خیر باد کہہ کے ایک بیکس و بے دیار پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ نہیں نہیں۔ یہ صرف حسینؑ کی حقانیت کی کشش تھی جس نے وہب کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور ایک منزل پر وہب اپنی ضعیف ماں اور زوجہ کے ساتھ فرزندِ رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

تاریخ کا بیان ہے کہ جب سرکار سیّد الشہداءؑ کا قافلہ مکّہ سے کربلا کی طرف جا رہا تھا تو راستہ میں ایک چھوٹا سا قافلہ نظر آیا۔ جس میں صرف تین افراد تھے۔ ایک ضعیف ماں، ایک بیٹا اور ایک اس کی زوجہ۔ ایک منزل پر قیام کے بعد ماں کے دل میں خیال پیدا ہوا اور اُس نے کہا: بیٹا ! ذرا جا کر یہ دریافت کرو کہ یہ قافلہ اس لُو دھوپ کی شدّت میں گھر سے کیوں نکل آیا۔ آخر یہ کون لوگ ہیں اور کہاں کا ارادہ رکھتے ہیں ؟ ان کے قافلے میں تو چھوٹے چھوٹے بچے بھی معلوم ہوتے ہیں، ان کے ساتھ خواتین کی بھی ایک جماعت ہے۔ آخر انھوں نے اس موسم میں گھر کیوں چھوڑ دیا؟ کون سی ضرورت تھی جس نے انھیں اس طرح غریب الوطن کر دیا۔

بیٹے نے ماں کا حکم سُنا اور دوڑ کر قافلہ کے قریب آیا۔ کسی سے دریافت

کیا، بھائی! یہ کس کا قافلہ ہے؟ کہاں سے آ رہا ہے؟ اور کہاں کا قصد ہے؟ اس قافلے نے اس موسم میں کیوں گھر چھوڑ دیا؟ اور کیا ان لوگوں کے پاس کوئی منزل نہیں ہے جو بچّوں اور عورتوں کو لیکر نکل پڑے ہیں۔

یہ سُننا تھا کہ ایک ساتھی نے بڑھ کر آواز دی۔ بھائی! تجھے خبر نہیں ہے یہ مسلمانوں کے رسولؐ کے نواسے حسینؑ بن فاطمہؑ کا قافلہ ہے جسے امّت نے مدینہ میں رہنے نہیں دیا اور اب مکّہ معظمہ سے بھی جُدا ہو کر صحرا نوردی میں مصروف ہے۔ اے بھائی! اس قافلے کی "بظاہر" کوئی منزل نہیں ہے لیکن یہ موت کی طرف جا رہا ہے اور موت اسے لیے جا رہی ہے۔ رسولِ اسلام کا نواسہ غریب الوطن ہو کر اپنے چھوٹے چھوٹے بچّوں کے ساتھ لُو اور دھوپ کی شدّت میں مدّت سے یونہی گرمِ سفر ہے۔

وہب نے یہ تقریر سُنی اور دوڑ کر آئے۔ کہنے لگے مادرِ گرامی! غضب ہو گیا۔ یہ تو مسلمانوں کے رسولؐ کا نواسہ ہے جسے اُمّت نے اس طرح ستایا کہ اس کا وطن بھی چھوٹ گیا ہے۔ امّاں! کسی قوم نے اپنے رسول کی اولاد کو اس طرح نہیں ستایا ہے۔ امّاں! اس زندگانیٔ دنیا پر خاک ہے۔ یہ اللہ کا مقرّب بندہ دربدر کی ٹھوکریں کھائے اور ہم لوگ اپنے گھر کو جائیں۔ یہ ناممکن ہے۔ چلیے! اس غریب الوطن کا ساتھ دیں۔

عزادارو! یہ سُنکر مادرِ وہب اپنے فرزند کو لیے ہوئے فرزندِ رسول الثقلین کی خدمت میں آئی اور تینوں اسلام کے دائرے میں آ گئے۔ حسینیت نے خاموش تبلیغ کی اور وہب عیسائیت سے نکل کر اسلام کے دامن میں

آگیا۔

اب یہ قافلہ حسینؑ ابنِ علیؑ کے ساتھ ہے یہانتک کہ دوسری محرّم کو حسینؑ واردِ سرزمینِ کربلا ہوئے۔ ساتویں محرّم سے پانی بند ہوا۔ نویں محرّم کو حسینؑ چاروں طرف سے فوجوں سے گھر گئے اور یہ قافلہ حسینؑ کے ساتھ مصائب میں برابر کا شریک رہا۔ یہانتک کہ عاشور کا دن آگیا اور ایک مرتبہ ماں نے بیٹے کو بلا کر کہا: میرے لال! سنتے ہو، آج قربانیوں کا دن ہے آج ہر ماں اپنے نورِ نظر کو اپنے مولا پر قربان کرے گی۔ بیٹا! ایسا نہ ہو کہ کسی سیدانی کا لال قربان ہو جائے اور تم زندہ رہو۔ بیٹا! ایسا ہو گا تو محشر میں شہزادی زہراؑ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ جاؤ میرے لال، آقا سے اجازت طلب کرو اور سب سے پہلے اجازت لے کر میدان میں جاؤ۔ بیٹا! آج تو ایک ہی تمنا ہے کہ تم خون میں نہاؤ اور میں دیکھوں۔ تم گلا کٹاؤ اور میں مولا کی بارگاہ میں سرخرو ہو جاؤں۔ تم قتل ہو جاؤ اور میں اپنی شہزادی فاطمہ زہراؑ کو آواز دوں۔ شہزادی! یہ آپ کا غلام آپ کے نورِ نظر پر قربان ہو گیا۔

ماں کا حکم ملا۔ وہب چلے۔ امامؑ کی خدمت میں آئے، دستِ ادب جوڑ کر عرض کی۔ مولا! مجھے امّاں نے بھیجا ہے۔

وہب! خیر تو ہے کیوں بھیجا ہے؟

عرض کی آقا! آپؑ سے اذنِ جہاد لینے کے لیے بھیجا ہے۔ آقا! میری ماں کی تمنّا ہے کہ میں اُن کی نگاہوں کے سامنے خون میں نہالوں۔ میری ماں کی آرزو ہے کہ میں آپؑ کے قدموں پر سر قربان کر دوں۔ آقا! اجازت ہے؟

حسینؑ نے سر اُٹھا کر سر سے پیر تک وہب کو دیکھا۔ دل نے آواز دی، وہب یہ اپنی موت کی خبر سنانے کے لیے میں ہی رہ گیا تھا ہائے، یہ جوانی اور یہ مرنے کی آرزو۔ یہ شباب اور یہ موت کی تڑپ۔ اللہ! حسینؑ کتنا غریب و بیکس ہو گیا ہے کہ اِس سن وسال کے جوان بھی مرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ حسینؑ خاموش کھڑے ہیں اور وہب برابر اصرار کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مولا نے اجازت دی۔

وہب مسکراتے ہوئے ماں کی خدمت میں آئے۔ اور کہنے لگے:

امّاں! مرنے کی رضا مل گئی۔ امّاں! اب یہ آپ کا لال خون میں نہلانے جا رہا ہے۔ آپ کی آرزوؤں کی تصویر خاک میں ملنے جا رہی ہے۔

ماں نے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ اور خوش ہو کر فرمایا: جاؤ میرے لال جاؤ۔ خدا حافظ۔

وہب رخصت ہو کر میدان میں آئے۔ مصروفِ جہاد ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد متعدد دشمنوں کو فی النار کر کے خون میں نہا کر ماں کے سامنے آئے آواز دی "هَلْ رَضِيتِ عَنِّي يَا اُمَّاهُ"۔

مادرِ گرامی! اب تو خوش ہو گئیں؟۔

ماں نے یہ سُنا اور منھ پھیر لیا۔ وہب نے پھر دوبارہ سوال کیا۔ ماں نے کوئی توجّہ نہ کی۔ آخر کار بیٹے نے کہا: امّاں! آپ کا لال خون میں نہا کر آیا ہے، اب تو رضا کی سند دیدیجیے۔

ماں نے تڑپ کر کہا۔ میرے لال! زندہ میدان سے واپس آیا ہے،

اور ماں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ جا جب تک سر تن سے جُدا نہ ہوگا یہ ماں راضی نہ ہوگی۔

وہب نے ماں کا ارشاد سُنا اور میدان کا رُخ کیا۔ چلنے لگے تو دیکھا کہ درِ خیمہ پر زوجہ سر جھکائے کھڑی ہے۔ گھبرا کے پوچھا، مومنہ! یہاں کیوں کھڑی ہے؟

اُس نے کہا، وارث! تم تو مرنے جا رہے ہو۔ یہ تو بتا تے جاؤ کہ اس عالمِ غُربت میں میرا کون ہوگا۔

ماں نے اس منظر کو دیکھ لیا۔ آواز دی بیٹا! زوجہ کے کہنے میں نہ آنا۔

وہب نے دامن چھڑا کے چلنے کا ارادہ کیا۔

زوجہ نے کہا، والی! جب تک مولا کے پاس چل کے ان کے سامنے دو ایک باتوں کا وعدہ نہ کر لیں گے میں نہ جانے دوں گی۔

وہب زوجہ کو لیے ہوئے آقا کی خدمت میں آئے۔ عرض کی مولا! یہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

فرزندِ رسولؐ نے پوچھا مومنہ! کیا کہنا چاہتی ہے؟

اُس نے کہا، آقا! وہب میدان میں جا رہے ہیں۔ یہ ابھی شہید ہو جائیں گے اور جنّت میں چلے جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ آپؑ کے سامنے وعدہ کریں کہ میرے بغیر جنّت میں قدم نہ رکھیں گے۔

سردارِ جوانانِ جنّت حسینؑ نے آواز دی مومنہ! یہ وہب سے کیوں کہہ رہی ہو۔ اس کا ذمّہ دار حسینؑ ہے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہب تیرے بغیر جنّت میں نہ جائیں گے۔

مولا کا یہ کرم دیکھنا تھا کہ ایک مرتبہ زوجۂ وہب نے عرض کی، آقا!
اور ایک بات آپؑ سے بھی کہنا ہے۔ فرزندِ رسولؐ نے فرمایا، مومنہ! وہ کیا؟
اُس نے کہا، آقا! وہب میدان میں جا کر شہید ہو جائیں گے اور میں
اکیلی رہ جاؤں گی۔ اے عزّت و ناموس کے محافظ آقا! مجھے شہزادیوں کی خدمت
میں بھیج دیجیے تاکہ وارث کے بعد میرا پردہ تو رہ جائے۔

عزادارو! یہ سُننا تھا کہ امامؑ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔
دل نے آواز دی، زوجۂ وہب! تجھے کیا خبر؟ تو سمجھتی ہے کہ سیدانیوں کا
پردہ رہ جائے گا؟ لیکن میں عصر کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ جب میری شہادت
کے بعد خیموں میں آگ لگے گی اور سیدانیوں کے سروں سے چادریں چھینی جائیں
گی۔ بیبیوں کے کھلے ہوئے سر ہوں گے اور تماشائیوں کا مجمع، کوفہ و شام کے
بازار ہوں گے اور آلِ محمدؐ کی دربدری۔ ایک منادی آواز دیتا ہوا چلے گا۔

تماشائیو! تماشا دیکھو، یہ آلِ محمدؐ قیدی بنا کر لے جائے جا رہے ہیں۔
یہ رسولؐ اللہ کی بیٹیاں ہیں جن کے بازوؤں میں رسّیاں بندھی ہوئی ہیں،
اور یہ رسولؐ اللہ کا لال ہے جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں
گلے میں طوقِ خاردار پڑا ہے۔

(اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ٥)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاۗءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ سَیِّدِنَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَآئِہِمْ اَجْمَعِیْنَ : اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ o

" وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ "

مالکِ کائنات کا ارشاد ہے کہ میرا حبیبؐ جس کا اسمِ گرامی محمدؐ ہے یہ صرف میرا رسولؐ ہے۔ اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ رسالت کیا ہے اور اس کے معانی کیا ہیں۔ کسی انسان کے رسول ہونے کا کیا مطلب ہے اور اس کا رتبہ کیا ہوتا ہے اِن اُمور کی وضاحت سے پہلے ایک نکتہ کی طرف آپ کے ذہن کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے ان تمام اُلجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کیلئے صرف ایک جملہ استعمال کیا ہے۔" قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ "۔ اس کے پہلے بھی رسول

گذر چکے ہیں۔ یعنی نہ یہ انوکھا رسول ہے اور نہ اس کی نرالی رسالت ہے
رسالت کیا ہے؟ یہ تمھیں معلوم ہے۔ رسول کیسا ہوتا ہے، اِس کا تمھیں
تجربہ ہے۔ اب یہ بحث غلط ہے کہ اس رسول کی حیثیت کیا ہے اور
اس کا کردار کیا ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ جیسے تم نے رسولوں کو دیکھا
ہے ویسا ہی بلند کردار اِس رسول کا بھی ہے۔ یہ بحث الگ ہے کہ رسولوں
میں اِس رسول کا مرتبہ کیا ہے اور نمائندگانِ الٰہی میں اس کی منزل کیا ہے لیکن
یہ بہر حال مسلّمہ ہے کہ رسالت کے لیے جو کمالات و کرامات۔ جو عظمت
جلالت اور جو بلندئ کردار ضروری ہے وہ سب اِس رسول میں موجود ہیں۔
اگر تم نے تاریخ میں کوئی ایسا رسول دیکھا ہے جو جاہل اِس دُنیا میں آیا ہو۔
کوئی ایسا رسول دیکھا ہے جس کے کردار میں کوئی کمزوری رہی ہو۔ کوئی ایسا
رسول دیکھا ہے جس کے آباء و اجداد کا کردار پاک نہ رہا ہو۔ کسی ایسے رسول
کا تجربہ کیا ہے جو اولاد و اعزا کی محبّت میں جادۂ حق اور صراطِ مستقیم سے
ہٹ گیا ہو، تو اِس رسول کی زندگی میں بھی ایسی کمزوریاں تلاش کرنا اور اگر
تاریخ میں کسی رسول یا نبی کے کردار میں ایسی کمزوری نہیں ہے تو اس رسول
کے کردار میں بھی کوئی عیب نہیں ہے۔ کردارِ رسالت میں عیب کا تلاش کرنا
تاریخِ اسلام سے ناواقفیّت اور حقائقِ قرآن سے جہالت کا نتیجہ ہے۔

حیرت ہے اُن مسلمانوں پر جو آج رسولِ اعظمؐ کے کردار میں زبردستی
کمزوریاں پیدا کر رہے ہیں اور کسی نہ کسی طرح مرسلِ اعظمؐ کو بھی اپنی سطح پر
لانا چاہتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی نبی کی اُمت نے یہ طریقہ کار اختیار

نہیں کیا جو اُمّتِ اسلامیہ اختیار کر رہی ہے۔ نبی تو نبی۔ دنیا کے دوسرے رہنماؤں اور دوسرے مذاہب کے سربراہوں کی تاریخیں پڑھیں۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہر قوم کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے رہنماؤں کے کردار کو بلند سے بلند تر بنا کر پیش کرے۔ اگر کہیں کوئی کمزوری رہ گئی ہے تو اس کا انکار کر دیا جائے یا کم از کم تاویل کر کے دنیا کو مطمئن کیا جائے کہ سربراہِ قوم کے کردار میں کوئی عیب نہیں ہے۔ حد ہو گئی کہ دنیا کی دوسری قوموں نے اپنے رہنماؤں کے سلسلے میں ایسے ایسے واقعات بیان کیے ہیں جو کسی طرح عقل میں آنے والے اور قرینِ قیاس نہیں ہیں لیکن کسی قوم نے اظہارِ فضائل میں اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ دوسری قوم مانے گی یا نہیں، دوسرے لوگ

باور کریں گے یا نہیں۔ انھوں نے اپنے رہنما کو جیسا مانا یا سمجھا بلا جھجک بیان کر دیا۔

یہ بدقسمتی تو صرف اُمّتِ اسلامیہ کا حصّہ ہے کہ وہ حقیقتوں کے اعلان میں غیروں کا منھ دیکھا کرتی ہے۔ اور جہاں دوسروں کے مزاج کو برہم ہوتے دیکھا وہیں سے مذہب میں ترمیم شروع کر دی۔ انصاف سے بتائیے مذہب کے حق میں اُس سے بڑا دشمن کون ہو سکتا ہے جو قوموں کے ذہن کو بدلنے کے بجائے مذہب ہی کو تباہ و برباد کر دے۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ مذہب کی ذمّہ داری اُن افراد نے سنبھال لی جن کے پاس تخت و تاج اور دولتِ دنیا تو تھی لیکن علوم و کمالات کا ذخیرہ نہ تھا تخت و تاج سے عیش و عشرت کا سامان ہو سکتا ہے، علوم کی گتھیاں نہیں

سلجھائی جا سکتیں۔ یہ احسان تھا آلِ محمدؐ کا کہ انھوں نے تخت و تاج کو ٹھوکر مار کر بساطِ علم بچھا دی اور نازک سے نازک وقت میں مذہب کی عزّت و آبرو کا تحفظ کیا۔ یہی وجہ تو ہے کہ آج تخت و تاج کے نشانات مٹ گئے لیکن علومِ آلِ محمدؐ کے آثار چاروں طرف بکھرے نظر آرہے ہیں۔

دنیا کی دوسری قوموں کو جانے دیجیے خود اُن اقوامِ عالم کا جائزہ لیجیے جنھوں نے ہر دور میں مذہب کا نام لیا ہے اور کسی نہ کسی شکل سے اپنے مذہبی روایات کو زندہ رکھا ہے۔ ان ساری اقوام کا جائزہ صاف آواز دے رہا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں ان کا طرزِ عمل دو طرح کا رہا ہے۔ بعض افراد نے انبیاءؑ کو باقاعدہ اسی طرح تسلیم کیا ہے جس طرح انھوں نے اپنے کو پہچنوایا تھا، اور جس طرح خالقِ کائنات نے انھیں عہدۂ نبوّت سے سرفراز کیا تھا اور کچھ لوگوں نے سرے سے نبوّت کا انکار کر دیا اور صاف اعلان کر دیا۔ تم ہمیں جیسے ایک انسان ہو اور پروردگار نے کوئی وحی وغیرہ نازل نہیں کی۔ کبھی یہ کہہ دیا کہ خدا کو وحی نازل کرنا ہوتی تو کسی بڑے آدمی پر نازل کرتا غربت زدہ لوگوں پر نہیں۔ کبھی کسی لفظ میں۔ لیکن ہر دور میں ایسی ایک قوم رہی ہے جس نے صاف لفظوں میں انبیاءؑ کی نبوّتوں کا انکار کیا اور اس پر ایمان لانے کو قطعی غیر ضروری بلکہ مہمل خیال کیا ہے۔

مجھے اس بات سے بحث کرنا نہیں ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال میں کس حد تک گمراہ تھے اور ان کی گمراہی کے اسباب کیا تھے۔ اتنے واضح معجزات کے باوجود انھیں دولتِ ایمان کیوں نہیں ملی اور ان کا دل نورِ یقین سے کیوں منوّر

نہیں ہوا اور نہ اِس وقت اُن افراد سے بحث کرنا ہے جو نبوّتوں پر ایمان لائے اور اُنھوں نے انبیاءؑ کی شخصیتوں کو پہچانا۔ معجزات کا اقرار کیا عظمتوں کا اعتراف کیا اور صاف واضح کر دیا کہ نورِ ایمان ہر دور میں باصلاحیّت دلوں میں متوّر ہو سکتا ہے۔ مجھے ان حضرات کے ایمان اور اس کے درجات سے بھی بحث کرنا نہیں ہے اور نہ آج اس کا محل ہے۔

اِس وقت تو صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دورِ آدمؑ سے آج تک انبیاءؑ کے بارے میں دو ہی طرح کے نظریات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مکمّل اقرار یا مکمّل انکار۔ سابق اُمّتوں میں ایسا ضرور ہوا ہے کہ ایمان لانے والوں نے بھی انبیاءؑ سے غدّاری کی ہے اور ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ان کے بارے میں غلط عقائد پھیلائے ہیں۔ لیکن کم از کم اتنا ضرور ہوا ہے کہ تاریخ نے ان کی شدید گرفت کی ہے اور اہلِ عقل و انصاف نے ان پر سے اپنا اعتماد اٹھا لیا ہے۔ لیکن یہ بدقسمتی صرف اُمّتِ اسلامیہ کا حصّہ ہے کہ یہ ایمان لانے کے بعد دو حصّوں میں بٹ گئی اور اپنی تفریق پسند طبیعت سے خود نبوّت کا بٹوارہ شروع کر دیا۔ مجھے ان کفّار و مشرکین سے کیا شکوہ ہو جنھوں نے سرے سے نبوّت کے ماننے سے انکار کر دیا، یا مرسلِ اعظمؐ سے برسرِ پیکار ہو گئے۔ ان کی جہالت و ضلالت تو صاف واضح ہے ان کی جہالت سے اسلام یا کردارِ بانیٔ اسلام بدنام نہیں ہو سکتا۔

شکوہ ان مسلمانوں سے ہے جو اپنے کو اسلام اور بانیٔ اسلام کا مخلص کہتے ہیں اور پھر پیغمبرؐ کی زندگی سے اپنا اعتبار اٹھا لیتے ہیں۔

میری نظر میں تاریخ میں آج تک کوئی ایسی قوم پیدا نہیں ہوئی جس نے اپنے نبیؐ کی زندگی کو دو حصّوں پر تقسیم کیا ہو۔ ایک شریعت اور ایک سیاست ایک کا تعلّق دنیا سے ہو اور ایک کا دین سے ۔ یہ صرف اُمّتِ اسلامیہ کا امتیاز ہے کہ اس نے نبیؐ کریمؐ کے کردار کو بھی پاک و پاکیزہ نہیں رہنے دیا اور کلمہ پڑھنے کے باوجود نبیؐ کی زندگی پر اعتراض کرنے کے راستے نکال لیے ۔

کہا یہ جاتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی شخصیت کے دو شعبے ہیں۔ ایک آپؐ کی بشریت اور ایک آپؐ کی نبوّت ۔ مالکِ کائنات نے آپؐ کو نبی ضرور بنایا ہے لیکن انسان ہی کے بھیس میں ۔ رسالت کا منصب ضرور عطا کیا ہے لیکن بشر بنانے کے بعد ۔ اِس لیے آپؐ کی زندگی میں دونوں چیزوں کے آثار ہونے چاہئیں اگر ایک طرف رسالت و نبوّت کی بلندیاں عصمت و علم و کمال ہو، تو دوسری طرف بشریّت اور انسانیت کی کمزوریاں بھی ہونی چاہئیں بغیر اس کے شخصیّت کے دونوں پہلو نمایاں نہ ہو سکیں گے اور زندگی نامکمل رہ جائے گی ۔

ان دونوں پہلوؤں کی حفاظت کے لیے مسلمانوں نے یہ راستہ نکالا ہے کہ مرسلِ اعظمؐ کی زندگی کے اعمال کو دو حصّوں پر بانٹ دیا جائے، کچھ کام وہ رکھے جائیں جن کا تعلّق دین اور شریعت سے ہو جیسے نماز، روزہ حج، زکوٰۃ۔ اور کچھ کام وہ قرار دیے جائیں جن کا دین و شریعت سے کوئی تعلّق نہیں ہے۔ جیسے کھانا، پینا، سونا، جاگنا صلح و جنگ وغیرہ ۔ نماز، روزہ صرف اہلِ دین و شریعت کیا کرتے ہیں لیکن کھانے پینے میں

تو دین دار اور بے دین برابر کے حصہ دار ہیں۔ اسے دین کا مسئلہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

زندگی کے اعمال کی اس تقسیم کے بعد دوسرا مرحلہ بالکل آسان ہو جاتا ہے جن اعمال کا تعلق دین و شریعت سے ہے ان میں رسول کو نبی و رسول تسلیم کرکے ان کی ہر بات کو مان لیا جائے اور جن چیزوں کا تعلق دنیاداری سے ہے ان میں آپ کو ایک عام انسان سمجھا جائے اور آپ کے احکام و تعلیمات پر خود غور کیا جائے اس لیے کہ جس طرح اللہ نے انھیں عقل دی ہے ویسے ہی ہمیں بھی اس جوہر سے نوازا ہے۔ جیسے فیصلہ کرنے کی قوّت ان میں ہے ویسے ہی ہم میں بھی ہے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اپنی عقلوں کو معطّل اور بیکار بناکر ہر بات میں انھیں کے قول پر اعتماد کریں اور وہ جس طرح چاہیں ہمیں اپنی مرضی کے راستے پر چلائیں۔

ہم نے کلمہ ضرور پڑھا ہے، رسالت و نبوّت کی گواہی ضرور دی ہے۔ انھیں اللہ کا رسول ضرور مانا ہے لیکن ان تمام باتوں کا تعلّق دین و شریعت سے ہے۔ دنیاوی زندگی کے مسائل میں انھیں رسول و نبی نہیں مانا ہے اور نہ ان کی بشریت کا کلمہ پڑھا ہے۔

ہم سے یہ مطالبہ کرنا کہ ہم دنیاوی مسائل میں بھی ان کی تقلید کریں قطعی غلط ہے۔ ایسا ہی ہوتا تو پروردگارِ عالم ہمیں عقل نہ دیتا اور ساری عقل ایک پیغمبر کے حوالے کر دیتا۔ عقل دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم کچھ کام اپنی عقل سے کریں اور کچھ کاموں میں دین و عقیدے کے رشتے سے نبی یا

رسول پر اعتماد کریں۔

اربابِ کرم! یہ ہے آج کی دنیائے اسلام کا فلسفہ، اور یہ ہے وہ سعادتمند اُمّت جو اپنے نبی کے اتباع سے جان بچانے کے لیے طرح طرح کے بہانے تلاش کر رہی ہے۔ مسلمان کا مقصد صرف یہ ہے کہ جہاں رسولِ اسلام کا اتباع اپنے مزاج پر گراں ہو اور اسلام کی تعلیم اپنی طبیعت کے خلاف ہو وہاں بشریت و رسالت کا جھگڑا اُٹھا کر اپنی رائے پر عمل کر لیا جائے اور رسولِ اعظمؐ کے فرمان کو ٹھکرا دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے صلح و جنگ کو شریعت سے نکال کر سیاست کے حصّہ میں ڈال دیا ہے اور اسے رسولِ اکرمؐ کی رائے کا تابع نہیں مانا۔ اس لیے کہ یہی جگہ وہ ہے جہاں جان کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ مال غنیمت کے امکانات کے باوجود تلوار نیام میں رکھنا پڑتی ہے۔ اور یہ باتیں ہر انسان کا مزاج نہیں برداشت کر سکتا۔

اسلامی قانون کا مطالعہ صاف بتا رہا ہے کہ صلح یا جنگ کا تعلق حکومت و اقتدار اور تخت و تاج سے نہیں ہے۔ صلح و جنگ اسلام کی حفاظت اور قانونِ الٰہی کی برتری کے تحفّظ کے لیے ہوتی ہے اس کا تمام تر تعلق شریعت و مذہب سے ہے۔ سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو صلح و جنگ کی ذمّہ داری نماز اور روزہ سے بھی زیادہ ہے، نماز، روزہ انسان کا ذاتی عمل ہے۔ اِس کے بگڑ جانے سے انسان کے گنہگار ہو جانے کا اندیشہ ہے لیکن صلح و جنگ کا تعلق کسی انسان کے ذاتی اور انفرادی عمل سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا براہ راست ربط مذہب اور

اس کی حفاظت سے ہے۔ اِس کے غلط ہو جانے میں بیجا خون بہانے
اور اسلام کے سفاک و خونریز کہے جانے کا خطرہ ہے اور ظاہر ہے کہ
انفرادی خطرہ اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا اہم وہ خطرہ ہوتا ہے جہاں مذہب
پر آنچ آنے لگے۔ اور ناحق خون بہائے جانے لگیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ عرب اپنی پرانی فطرت اور جنگجو طبیعت سے مجبور
تھے، اُنھوں نے کلمہ تو پڑھ لیا تھا، اسلام کے دامن میں پناہ تو لے لی تھی لیکن
ان کے دل و دماغ میں صحیح طریقہ سے مذہب نہیں اترا تھا۔ ان کا منشار
یہ تھا کہ اسلام لانے کے باوجود اپنے نفس کی تسکین کا سامان فراہم رہے
اور جب مال غنیمت کی خواہش بیدار ہو میدان جنگ میں کود پڑیں، اور
جہاں زندگی خطرے میں نظر آنے لگے صلح و مصالحت کی بات چیت
شروع کر دیں۔

اسلام ایسے ہی مزاج کو بدلنا چاہتا تھا اور اس کا یہی مقصد تھا کہ
میرے دائرے میں قدم رکھنے والے انسان عام انسانوں سے الگ ہو جائیں
اور ان کے دل و دماغ ایک نئے سانچے میں ڈھال دیے جائیں۔

اسی لیے اس نے واضح لفظوں میں اعلان کر دیا کہ میرے رسولؐ کی
زندگی کو دو حصّوں پر بانٹنا مجھ سے غدّاری ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ

میرا پیغمبر (محمدؐ) صرف پیغمبر ہے۔ اس کا ہر عمل رسالت کا عمل ہے
اور اس کی ہر ادا نبوّت کی ادا ہے۔ وہ بولتا ہے تو وحیٔ خدا سے بولتا ہے

ہاتھ اٹھاتا ہے تو اشارۂ خداوندی کے بعد اٹھاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کی مشیت بھی مشیّتِ الٰہی کی پابند ہے۔

"وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّآ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ"

قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جہاں رسولؐ کی زندگی کو دو حصّوں پر تقسیم کیا گیا ہو اور اس میں نبوّت و بشریّت کا فرق قائم کیا گیا ہو، یہ صرف مسلمانوں کے ذہن کی پیداوار ہے جو ہر دَور میں مختلف شکلوں میں سامنے آتی رہی ہے اور جس کا مقصد توہینِ رسالت کے سوا کچھ نہیں ہے حیرت تو یہ ہے کہ کل مسلمانوں نے قرآن کو کافی کہا تھا اور آج اسی قرآن سے روگردانی کی جا رہی ہے۔ گویا یہ ایک خاموش اقرار ہے کہ ہمیں جب بھی کسی نمائندۂ الٰہی کی پیروی کا حکم دیا جاتا ہے تو ہم کسی نہ کسی بہانے سے بچ نکلتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے کہ اسلام اخلاصِ عمل کا نام ہے، عیّاریوں اور مکّاریوں کا نہیں۔ عیار و مکّار سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن واقعی مسلمان نہیں ہو سکتا۔

مذہب و شریعت اور منصبِ الٰہی پر مکمل اعتماد کا نقشہ دیکھنا ہو تو کربلا کے میدان میں آئیے جہاں ایک ایک بچّہ منصب کی عظمت سے باخبر اور ایک ایک خاتون قانونِ الٰہی پر مکمّل اعتماد رکھنے والی ہے۔ کیا دنیا اس حقیقت کو بھلا دے گی کہ ایک ماں یا ایک باپ کے دل میں اولاد کی کتنی محبت ہوتی ہے اور دنیا عزیزوں پر ہر دولت قربان کر سکتی ہے لیکن اولاد نہیں۔ یہ صرف کربلا والے تھے جہاں ہر ماں اپنی اولاد کو قربان کرنے کے لیے بے چین تھی اور کسی ایک ذہن میں بھی یہ خیال نہیں آیا کہ جنگ کے معاملہ

میں کسی کی پیروی فرض نہیں ہے وہاں ہر انسان کو اپنی رائے پر عمل کرنا چاہیے اور حتیّ الامکان جان بچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

خدا جانتا ہے اس حوصلے کے باپ اور اس حوصلے کی ماں کسی تاریخ میں نہیں ملتی جس حوصلے و ہمّت کے ماں باپ کربلا کے میدان میں نظر آتے ہیں۔ کوئی باپ اپنے بیٹے کو میدان میں بھیج دے رہا ہے کوئی ماں اپنی اولاد کو خون میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔

کوئی زوجہ راہِ خدا میں اپنا سہاگ اُجڑ جانے ہی سے خوش ہے۔ کیا تاریخ مسلم بن عوسجہ کی زوجہ کے کردار کو نظر انداز کر دے گی۔ وہ خاتون جو جذبۂ خدمت دین میں شوہر کی ہمسر اور محبّت میں سرشار تھی۔ جس کی نگاہ میں عاشور کے دن اپنے گھر کا برباد ہو جانا ہی ضروری تھا۔ جس کے حوصلہ کا یہ عالم تھا کہ غربت و مسافرت کے عالم میں شوہر کو مرنے کے لیے بھیج دیا اور اپنی تباہی کا ذرّہ برابر خیال نہ کیا۔

شوہر بھی کیسا شوہر۔ زوجہ کے جذبات کا قدرداں حسینؑ کا غلام عوسجہ کا لال اور صحیح معنوں میں مسلم، امامؑ سے اِذنِ جہاد لیکر میدان میں آئے۔ تاحدِ امکان جنگ کی اور جب زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرنے لگے تو امامؑ کو آواز دی۔ مولا آئیے! غلام کی خبر لیجیے۔۔ آقا! چاہنے والا دنیا سے رخصت ہو رہا ہے اب آجائیے۔۔ فرزند رسولؐ! جلدی تشریف لائیے۔ ایسا نہ ہو کہ غلام دم توڑ دے اور وقتِ آخر آپؑ کی زیارت بھی نہ ہو سکے۔

حسینؑ کے کانوں میں آواز آئی۔ تیزی سے اُٹھے۔ میدان کا رُخ کیا۔ حبیب کو ساتھ لیا۔ دوڑتے ہوئے مسلم کے سرہانے پہونچے۔ چاہنے والے کو نزع کے عالم میں دیکھا۔ کون جانے حسینؑ پر کیا گذر گئی۔ عجب نہیں مولا کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئے ہوں۔ مسلم! اب تم بھی حسینؑ کا ساتھ چھوڑے دے رہے ہو۔؟ مسلم! میں اکیلا رہا جا رہا ہوں۔ مسلم! میرے چاہنے والے ایک ایک کر کے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

غلام نے آقا کے دردِ دل کا احساس کیا۔ مولا سے نظر چار کرتے تو کیونکر۔؟ حسرت سے حبیب کی طرف دیکھا۔ حبیب مقصد سمجھے۔ کہنے لگے مسلم! غالباً تم کوئی وصیّت کرنا چاہتے ہو۔؟

مسلم نے حبیب کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جذبات کا طوفان دیکھا اور دھیمی آواز سے کہا۔ حبیب! کیا وصیّت کروں؟ اب تم بھی میرے ہی پاس آرہے ہو۔ حبیب نے مسلم کے جذبات کا اندازہ کیا۔ سہارا دیتے ہوئے فرمایا۔ مسلم! یہ صحیح ہے کہ اب زندگی کا کوئی لطف نہیں ہے۔ یہ زندگی کس کام کی۔ کہ نبی زادہ نرغۂ اعداء میں گھرا رہے اور ہم لوگ زندہ رہیں۔ لیکن اے مسلم! یقین کرو۔ اگر تم کوئی وصیت کرو گے تو مرتے دم تک اس پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔

مسلم کا تڑپتا ہوا دل ٹھہرا۔ سانس رُکی۔ ایک مرتبہ حسرت و یاس سے مولا کے چہرہ پر نظر ڈالی اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز سے فرمایا۔ حبیب! اور کوئی وصیّت نہیں ہے۔ زوجہ کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے

کمسن بچے کا کوئی خیال نہیں ہے۔ بس صرف ایک تمنا ہے۔ دیکھو! جب تک زندہ رہنا مولا پر آنچ نہ آنے دینا۔ حبیب کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ مولا، غلام کا جذبۂ وِلا دیکھ کر رو دیے ۔ اللہ! ایسے باوفا ساتھی کسے ملیں گے ۔ یہ میرا وفادار ہے جو وقتِ آخر بھی میری غربت و بیکسی پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

تاریخ بول سکتی تو بولتی ۔ مورّخ کے پہلو میں دل ہوتا تو جذبات کی ترجمانی کرتا۔ عقیدت کے سوا کون ہے جو حسینؑ کی حالت بتا سکے اور محبّت کے علاوہ کون ہے جو آقا کے حالات کی ترجمانی کر سکے۔

مولا کلیجہ تھامے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ حکم قضا نافذ ہوا مَلک الموت اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے اور غلام دادِ وفا دیکر دنیا سے رُخصت ہو گیا۔ غلام کا سر۔ آقا کا زانو ۔ میں نہیں جانتا کہ حسینؑ نے اپنے زانو سے مسلم کا سر کیسے ہٹایا ہو گا۔ اور مقتل میں غلام کو چھوڑ کر کیونکر واپس چلے ہوں گے، لیکن مقاتل سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جب فرزندِ رسولؐ نے خیمہ کا رُخ کیا تو ابھی چند قدم بھی نہ چلنے پائے تھے کہ خیمہ گاہ سے ایک کمسن بچہ کو نکلتا ہوا دیکھا۔ سر پر چھوٹا سا عمامہ، دوش پر ننھی سی زرہ، کمر سے تلوار لگائے ہوئے۔ کمسنی کا یہ عالم کہ تلوار زمین پر خط دیتی جاتی ہے، تیزی سے میدان کی طرف دوڑتا ہوا جا رہا ہے۔

فرزندِ رسولؐ نے دیکھتے ہی آواز دی۔ حبیب! یہ کس کا بچہ ہے، اور خیمہ گاہ سے نکل کر کدھر جا رہا ہے؟ ذرا اسے روکو۔ دیکھو تو میدان میں

تیروں کی بارش ہورہی ہے۔ اشقیاء ہر طرف آمادۂ قتل کھڑے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس معصوم کا بچپن خاک میں مل جائے۔

حبیب نے بڑھ کے بچے کو روکا۔ بچے نے لاکھ کوشش کی، لیکن حبیب اسے لیکر خدمتِ امامؑ میں حاضر ہوئے۔ امامؑ نے فرطِ محبت سے بچے کو گلے سے لگالیا۔ چہرے سے یتیمی کے آثار نمایاں، تیوریوں پر بَل، دل میں نصرتِ امامؑ کا جذبہ۔ فرمایا، میرے لال! تو کس کا فرزند ہے؟ اور کہاں جارہا ہے؟ بیٹا، اس میدانِ کربلا میں تیرا کیا کام ہے۔

عرض کی مولا! میں مسلم بن عوسجہ کا فرزند ہوں۔ اب میدان میں آپ کے قدموں پہ سر نثار کرنے جارہا ہوں۔ دیر سے میرے بابا کی خبر بھی نہیں آئی ہے۔ خدا جانے میرے باپ پر کیا گذر گئی۔

امام علیہ السلام نے فرمایا، میرے لال! پلٹ جا۔ ایسا نہ ہو کہ تیرا گھر سے نکلنا تیری ماں کے دل پر شاق ہو؟

یہ سُننا تھا، بچے نے دستِ ادب جوڑ کر عرض کیا، مولا! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آقا! یہ تلوار کمر سے کس نے لگائی ہے۔ یہ عمامہ سر پر کس نے باندھا ہے۔ یہ زرہ تجھے کس نے پنھائی ہے؟

امام علیہ السلام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اللہ، یہ میری غربت و بیکسی کہ اب عورتیں اپنی گود کے پالوں کو یوں سجا کر میدان میں بھیج رہی ہیں۔ آنسوؤں کو روک کر فرمایا، بیٹا جاؤ، واپس جاؤ۔ میرے لال میں تیرے باپ کے سرہانے سے واپس آرہا ہوں۔ بیٹا! تیرا باپ راہِ خدا میں

کام آگیا۔ تیری ماں کے لیے یہی غم کیا کم ہے۔ اب اسے اپنا غم نہ دے۔

کمسن بچّے نے مولا کی گفتگو سن کر کلیجہ پکڑ لیا۔ ایک طرف یتیمی کا غم۔ دوسری طرف اذنِ جہاد نہ ملنے کا صدمہ۔ اللہ! کیا میرا مقدّر ایسا ہی ہے کہ نہ سر پر باپ کا سایہ رہ گیا، نہ مولا کی طرف سے یہ اجازت ملی کہ اپنا سر کٹا کر راہِ خدا میں سربلند ہوں اور اپنی ماں کا دل خوش کروں۔

بچّہ اسی کشمکش میں تھا۔ زبان پر الفاظ نہیں آرہے تھے کہ اپنے دردِ دل کا اظہار کرے۔ آنے والی سانس بھی رُک رُک کر آرہی تھی ہر منزل پر احساسِ یتیمی اور حسرتِ جہاد دل توڑے دے رہی تھی کہ ایک مرتبہ مقدر نے یاوری کی اور پسِ پردہ سے ایک نحیف آواز آئی۔

مولا! ایک بیوہ کا ہدیہ ہے رد نہ کیجیے گا، آقا! اسے اپنے اصغرؑ کا فدیہ سمجھیے۔ آقا! یہ میری آخری تمنّا ہے، اسے پامال نہ ہونے دیجیے۔ اے فاطمہؑ کے لال! اِس کنیز کی محنت سوارت ہو جانے دیجیے۔ میں اپنی آنکھوں سے اپنے لال کو خون میں نہایا ہوا دیکھ لوں۔

مولا نے دل کو سنبھالا۔ آنسوؤں کے سیلاب کو روکا۔ بچّہ کو اجازت دی، خدا جانتا ہے کہ حسینؑ نے کس دل سے اجازت دی ہوگی اور مولا کے دل پر کیا گذر گئی ہوگی۔ میدان میں مسلم کا لال پسِ پردہ مسلم کی بیوہ۔ ماں بیٹے کی آخری خبر کا انتظار کر رہی ہے۔

ایک مرتبہ بیکسی نے آواز دی۔ بیوۂ مسلم! تیری گود اُجڑ گئی۔ تیری آرزو پوری ہوگئی۔ تیری گود کا پالا میدان میں کام آگیا۔ مولا تیرے لال کی

میّت لے کر آ رہے ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ زوجۂ مسلم نے آنسو بہائے یا شکر کا سجدہ کیا۔ ہاں فضا میں یہ تاثیر ضرور رہ گئی کہ آج ہماری ماں بہنیں سر پیٹ پیٹ کر مسلم کے لال کا ماتم کر رہی ہیں، اور ہر دل آواز دے رہا ہے کاش ہم بھی کربلا کے میدان میں ہوتے تو اپنی گود کے پالوں کو زہرّا کے لال پر قربان کر دیتے۔

" اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ "

۶

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ نَا الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ وَالْعَنَۃُ الدَّائِمَۃُ عَلٰی اَعْدَائِھِمْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ ۔

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔"

ارشاد ربّ العزّت ہوتا ہے ۔ یہ محمدؐ صرف میرا رسول ہے ۔ اسے پہچاننا ہے تو صرف رسالت کے ذریعہ پہچانو ۔ رسالت سے ہٹ کر اس کی زندگی میں کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو اس کا مکمل تعارف کرا سکے اور اس کی بلند ترین ہستی کی نشاندہی کر سکے ، یہ رسالت ہی ہے جس نے اس کے جملہ کمالات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے اور اتنی عظمت پیدا کر لی ہے کہ مالکِ کائنات

نے اپنے حبیبؐ کے تعارف میں اس کے علاوہ کسی صفت کا ذکر نہیں کیا۔

مالکِ کائنات کے جتنے نمائندے اس کائنات کی ہدایت اور اس دنیائے انسانیت کو صراطِ مستقیم پر لگانے کے لیے آئے انھیں ربّ العزت نے مختلف القاب اور خطابات سے یاد کیا ہے کسی کو خلیفہ کہہ کے یاد کیا ہے کسی کو لفظ نبی سے تعبیر کیا ہے۔ کسی کو رسول کہہ کے پکارا ہے کسی کو امام بنایا ہے کسی کو ولی اور اولی الامر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ ہے ۔ ظاہر ہے کہ جب یہ الفاظ مختلف مواقع پر الگ الگ شخصیتوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں یا ایک ہی شخصیّت کے لیے مختلف حالات اور مواقع کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ تو ان کے درمیان کوئی نہ کوئی فرق ضرور ہوگا۔ اور ان کے معانی میں ایسی نزاکتیں ہوں گی جن کی بناء پر رسول کے موقع پر نبی نہیں کہا گیا اور نبی کے موقع پر لفظ امام سے یاد نہیں کیا گیا۔

ضرورت ہے کہ ہم قرآنِ حکیم اور بیانِ رسولؐ کی روشنی میں تلاش کریں کہ آخر ان الفاظ کا منشاء کیا ہے اور انھیں حالات و مقامات کے اعتبار سے الگ الگ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔

مذہب کی زبان میں تحقیق کرنے سے پہلے ایک نظر عرب کی زبان پر ڈالنا ہوگی، جہاں سے یہ الفاظ قرآن کریم یا بیانِ رسولؐ میں داخل ہوئے ہیں۔

اس لیے کہ عربی زبان بنیادی طور پر عرب ہی کی زبان ہے۔ خالقِ کائنات یا قرآن کریم کی ایجاد کی ہوئی نہیں ہے۔ قرآن حمید تو عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے

جیسا کہ اس نے خود اعلان کیا۔ " اِنَّا اَنزَلنٰہُ قُرءٰنًا عَرَبِیًّا "
ہم نے یہ قرآن عربی انداز میں نازل کیا ہے۔

ایسے حالات میں قرآن حکیم کے معانی و مطالب سمجھنے کے لیے عربی زبان کا سہارا لینا بےحد ضروری ہے۔ زبان ہمیشہ اہلِ زبان ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ محاورات کی خصوصیت زبان والے ہی پہچانا کرتے ہیں غیر زبان والا کسی زبان کے محاورات کا فیصلہ نہیں کر سکتا اور نہ اسے دوسری زبان کے معاملات میں دخل دینے کا حق ہے۔

زبان کا مسئلہ قوم و ملّت کے مزاج۔ طرزِ زندگی اور افتادِ طبع سے متعلّق ہوتا ہے۔ اسے عقل و منطق سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ اس کے مسائل فلسفہ کے اصول سے حل کر لیے جائیں۔ اہلِ زبان نے ایک لفظ کے لیے ایک معنی قرار دیدیے ہیں تو صبحِ قیامت وہی معنی رہیں گے چاہے دنیا کے تمام اہلِ عقل کو اس سے اختلاف ہو اور وہ اس معنی کو پسند نہ کریں۔ یہ ممکن ہے کہ اہلِ عقل اسی لفظ کو دوبارہ کسی اور معنی کے لیے بنالیں۔ لیکن یہ ان کی ذاتی اصطلاح ہوگی۔ اس سے زبان کے اصلی معنی پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔

زبان کا مسئلہ انسانی زندگی میں بالعموم اور آج کی دنیا میں بالخصوص ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ لسانیات کے ماہرین مسلسل تحقیق میں مصروف ہیں۔ ملکوں میں اس مسئلہ پر فسادات ہو رہے ہیں۔ دنیائے انسانیت کا خون ارزاں ہو رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا ترقّی کی اس منزل پر پہونچ گئی ہے جہاں زبان کے مسائل اسلحوں سے حل کیے جائیں گے اور لفظوں کے

استعمال کے لیے سینوں کا استعمال کیا جائے گا۔ حیرت ہے کہ یہ دنیا کدھر جارہی ہے اور اس کی عقل پر کتنے پردے پڑے جارہے ہیں۔ مجھے تو ایسا نظر آرہا ہے کہ اس دور کی زندگی میں پردے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ عقلوں پر جہالت کا پردہ۔ خیالات پر سیاست کا پردہ، شخصیت پر مکّاری کا پردہ، جہالت پر علم کا پردہ، کمزوری پر تکبّر و غرور کا پردہ، چلتی پھرتی میّتوں پر زندگی کا پردہ اور اتنے شدید پردوں کے بعد بھی نہیں ہے تو عورتوں کا پردہ، اور شاید یہ سب نتیجہ ہے اسی ایک پردہ کے نہ ہونے کا۔ کہ انسانی زندگی روز بروز پردوں میں چلی جارہی ہے اور کوئی حقیقت کھُل کر سامنے نہیں آرہی ہے۔

چھوڑئیے فی الحال ان بحثوں میں نہیں اُلجھنا ہے اس وقت تو قرآن کریم کے الفاظ کے معانی طے کرنا ہے اور اس کے لیے عربی لغت کا سہارا لینا ہے۔ قرآنِ حکیم کی یہ عظیم احتیاط تھی کہ اس نے زبان کے معاملات میں عرب کے جذبات کی قدر کی ہے اور اُن کے الفاظ کو جدید معانی نہیں پہنائے ورنہ عرب کی متعصّب دنیا میں ایک انقلاب برپا ہوجاتا اور کوئی قرآنِ حکیم کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔ یہ احتیاط اس منزل تک پہونچی کہ قرآن حکیم نے اپنے کو انھیں کی زبان کا معجزہ بنادیا اور انھیں واضح لفظوں میں یہ باور کرادیا کہ یہ بات تمھارے لیے باعثِ فخر ہے کہ تمھاری زبان میں ایک ایسا بلند کلام بھی پایا جاتا ہے جس کا جواب پوری دنیائے انسانیت کے پاس نہیں ہے۔ عرب نے اس نکتہ کو پہچانا یا نہیں۔ تاریخ اس سلسلے میں واضح

بیان دینے سے قاصر ہے لیکن آج عرب ممالک کے بیانات کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب دنیا کی آنکھیں کھل رہی ہیں اور عرب اسی ایک بات پر نازاں نظر آرہا ہے ہیں کہ قرآن ہماری زبان میں نازل ہوا ہے اور ہماری زبان میں ایک ایسا بھی کلام ہے جس کا جواب کسی زبان والے کے پاس نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم کے لیے ایک دشواری ضرور تھی ـــ کہ عرب نے اپنے الفاظ کے جو معانی تلاش کیے تھے اور جن مطالب کو ادا کرنے کے لیے الفاظ تراشے تھے وہ سب محسوس اور مادّی تھے۔ عالم احساس سے ماوراء ـــ اور ارواح و عقول کی منزل تک ان کے دماغوں کی رسائی نہ تھی۔ توحید و قیامت جیسے غیر محسوس مسائل اُن کی زندگی میں داخل نہ ہوئے تھے، اور انھیں ان کا تصوّر بھی نہ تھا ـ اور قرآنِ حکیم کو ایسے ہی افکار و عقائد کو دنیا کے حوالے کرنا تھا۔

ظاہر ہے کہ عربی کے الفاظ استعمال کرنے کا ایک عظیم نقصان یہ تھا کہ اس طرح لوگ الفاظ کے وہی معنی سمجھتے جو اُن کی زبان میں رائج تھے ـــ وہ لفظ "اِسْتَوٰی" سے وہی نشست کا اندازہ سمجھتے جو اُن کے سماج میں رائج تھا۔ "یَدُ اللهِ" سے وہی ہاتھ مراد لیتے جو اُن کے بدن کا ایک جزء تھا "کُرْسِیُّ" سے وہی کُرسی مراد لیتے جسے اپنے گھروں میں دیکھا تھا ـــ "قَلْب" سے وہی گوشت کا ٹکڑا مراد لیتے جسے اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے تھے اور قرآنِ حکیم کو اس سے بالاتر مفاہیم و خیالات کی نشاندہی کرنا تھی۔ سخت منزل تھی اور عجیب مرحلہ تھا۔ زبان کے معانی بھی نہ بدلنے پائیں اور

محسوس مزاج والوں کو معقولات تک پہونچا دیا جائے۔ مشاہدہ کے قیدیوں کو اسرارِ غیب سے آشنا بنا دیا جائے۔

یہ قرآن حکیم کے متکلّم کا کمال تھا کہ اس نے ایک لفظ سے سارے مسائل کو حل کر دیا اور ایک نکتہ کو ایجاد کر کے ساری دشواریوں کو آسان بنا دیا۔ اور وہ ہے لفظِ "تاویل"۔ اس نے آواز دی اس قرآن میں الفاظ کے معانی بھی ہیں اور تاویل بھی، اسے سمجھنے کے لیے اہلِ زبان کے بیانات سے بھی مدد لینا پڑے گی اور ہمارے افکار و نظریات سے بھی۔ تم نے صرف ان کے بیانات پر اعتماد کر لیا تو محسوسات میں گم ہو جاؤ گے اور عقائد کی بلند ترین منزلوں تک نہ پہونچ سکو گے اور صرف عقیدہ کو لے لیا تو اس کی تشریح کے لیے ہمارے بیان تک نہ پہونچ سکو گے۔ ضرورت ہے کہ عرب کے معانی کو ہمارے افکار کی روشنی میں سمجھو اور یہ اندازہ کرو کہ محسوسات کو معقولات کے سانچہ میں کیونکر ڈھالا جاتا ہے۔ مشاہدات کو دیکھ کر غیب تک رسائی کیونکر ہوتی ہے ــ اب اسلامی عقائد کو سمجھنا ہے تو "کرُسی" کو نہ دیکھو! اس کے غلبہ و احاطہ کو دیکھو۔ ہاتھ کو نہ دیکھو، اُس کی قوّت اور طاقت کو دیکھو ــ قلب کو نہ دیکھو، اس کے افکار و خیالات کو دیکھو، اپنا اندازِ نشست نہ دیکھو سلطانی قہر اور جبروتی اقتدار کو دیکھو۔

قرآن کریم کا یہ وہ سلیقۂ افہام و تفہیم تھا جسے حقیقی معنوں میں اس کا معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ اس نے اس اندازِ بیان کو اختیار کر کے کئی فائدے حاصل کیے ہیں۔

ایک طرف عرب کے جذبات کی حمایت کی اور زبان کے معانی میں دخل اندازی نہیں کی اور اس طرح بغاوت کے عظیم طوفان کو روک دیا اور سیلاب پر پہلی ہی منزل میں بندھ باندھ دیا۔ دوسری طرف انھیں الفاظ کا سہارا لیکر دنیائے عربیت کو اپنے عظیم اور وسیع ترین خیالات سے روشناس کر دیا۔

اور ان سب سے بالاتر اہلِ ہوا وہوس کے دماغوں پر پہرے بٹھا دیے اور انھیں حقائقِ قرآن میں دخل اندازی کرنے سے مکمّل طور پر روک دیا۔

یاد رکھو! اگر یہ قرآن صرف محسوسات اور مشاہدات کی دُنیا سے متعلق ہوتا تو ہر صاحبِ زبان الفاظ کے معانی کو دیکھ کر اس کی حقیقتوں تک پہونچ جاتا لیکن اسے کیا کروگے کہ اس میں معقولات اور غائبات کا بھی ایک سلسلہ ہے جسے انھیں الفاظ کے پردہ میں چھپا دیا گیا ہے اس کا اندازہ نہ الفاظ سے ہوگا نہ معانی سے۔ نہ زبان سے ہوگا نہ لغت سے۔ اس کا علم تو اسی پردہ ڈالنے والے کو ہوگا جس نے اس سلسلے کو پردے میں چھپایا ہے۔ اسی عالم الغیب کو ہوگا جسے غیبی اسرار کی مکمّل اطلاع ہے اور جس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرّہ باہر نہیں۔ اِسی لیے اُس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا:

"وَمَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ"

قرآن کے الفاظ کے معانی تو ہر عرب جانتا ہے اور اسی لیے اسے کلامِ بشر سے بالاتر اور معجزہ تسلیم کرتا ہے لیکن اسکی تاویل، اس کی حقیقت

اور اس کے معقولات و غائبات کو یا خدا جانتا ہے یا وہ لوگ جو علم میں رسوخ رکھتے ہیں اور جنھیں مالکِ قرآن نے علمِ قرآن عطا کیا ہے۔

اب پہچانا آپ نے۔ کہ قرآن اور اہلبیت کا رشتہ کیا ہے، اور پیغمبر اکرمؐ دنیا سے جاتے جاتے قرآن کے ساتھ اہلبیتؑ کو کیوں چھوڑ گئے تھے۔ یہ ایک اشارہ ہے کہ اُمّت تاویلِ قرآن۔ حقیقتِ قرآن۔ مقصد قرآن اور روحِ قرآن کا علم حاصل کرنا چاہے تو اسے اہلبیتؑ کی ڈیوڑھی پر آنا پڑے گا۔ (حدیث ہے:)

"فَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَاتِ الْبَابَ"

"جسے بھی علم حاصل کرنا ہو وہ باب مدینۂ علم تک آئے"

جسے بھی حکمت درکار ہو وہ علیؑ کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرے۔ قرآن ملے گا تو یہیں۔ اسلام ملے گا تو یہیں۔ دین ملے گا تو یہیں۔ احکام ملیں گے تو یہیں۔ نبوّت ملے گی تو اسی گھر میں۔ اور توحید کا سبق ملے گا تو اسی در سے۔

میں یہ گذارش کر رہا تھا، الفاظ قرآن کو سمجھنے کے لیے لغتِ عرب اور مزاجِ اسلام دونوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ تنہا کسی ایک کے علم سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ آئیے اسی روشنی میں ان الفاظ کے مفہوم پر غور کیا جائے۔ عربی زبان کے اعتبار سے نبی کے معنی ہیں، خبر دینے والا۔ رسول کے معنی ہیں پیغام پہونچانے والا۔ خلیفہ کے معنی ہیں کسی کی جگہ پر آنے والا۔ اور امام کے معنی ہیں کسی کے آگے چلنے والا۔

ظاہر ہے کہ محسوسات کی دنیا میں خبر۔ پیغام جگہ اور سامنے یا پیچھے کا ایک عام مفہوم ہے جس کا تعلّق صرف مادّیات سے ہے اور مذہب کے خیالات اس سے کہیں زیادہ بلند ہیں ـــــ یہاں خبر یا پیغام دنیا کے عام پیغام جیسا نہیں ہے۔ جگہ کا تصوّر عام مکانات کا نہیں ہے بلکہ یہ عظیم عہدے ہیں جن کی ایک معنویت ہے اور معنوی دنیا میں قدر و قیمت ہے۔

خبر دینا اور پیغام پہونچانا بظاہر ایک ہی ہے لیکن اگر آپ غور کریں گے تو دونوں میں ایک نازک سا فرق معلوم ہوگا۔ خبر دینے والے کی وہ ذمّہ داری نہیں ہوتی جو پیغام پہونچانے والے کی ذمّہ داری ہوتی ہے خبر دینے والے کی ذمہ داری خبر سُنا دینے کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور جسے پیغام دے کر بھیجا جاتا ہے اُس سے یہ اُمید ہوتی ہے کہ وہ اس پیغام پر عمل بھی کرائے گا۔ اِسی لیے شریعتِ اسلام نے نبی اور رسول کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ جس نمائندۂ الٰہی پر تبلیغ کی ذمّہ داری نہیں ہوتی اُسے نبی کہتے ہیں اور جس پر تبلیغ کی ذمّہ داری بھی ہوتی ہے اُسے رسول کہتے ہیں۔ خدا نے نبی ایک لاکھ چوبیس ہزار بھیجے ہیں لیکن رسول صرف تین سو تیرہ ہی بنائے ہیں۔ انبیاء اپنے عمل یا اپنے قول سے مرضئ خدا اور منشاءِ الٰہی کی خبر دیا کرتے تھے اور مرسلین، امّت کو عمل پر آمادہ کیا کرتے تھے انبیاء کے پاس تبلیغی نظام کا ہونا ضروری نہیں تھا لیکن مرسلین اپنے ساتھ پورا انتظام لے کر آیا کرتے تھے ـــــ یہ اور بات ہے کہ ایک منزل اِن

دونوں سے بھی بالاتر ہے جسے صاحبِ عزم کہا جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری صرف تبلیغ کی نہیں ہے، بلکہ بدلے ہوئے حالات میں نئی شریعت اور نئے قانون کو رواج دینا بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ دوسرے کے پیغام پر عمل کی دعوت دینا اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا ایک نئے پیغام کو پیش کر دینا یا رائج کر دینا۔ اس منزل پر ہزاروں شبہات کا سامنا ہوتا ہے۔ سیکڑوں بغاوتیں سر اُٹھاتی ہیں اور ہر انسان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب کل کی شریعت بھی خدا ہی کی شریعت تھی تو آج اسے بدلا کیوں گیا، اور اس میں انقلاب کیوں لایا گیا تفصیل کا وقت نہیں ہے ورنہ میں نئے نظام کے رائج کرنے کی دشواریاں اور عوام کے جذباتِ بغاوت کا تجزیہ کر کے بتاتا کہ یہ کام کتنا بڑا حوصلہ اور کتنا پختہ عزم چاہتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جن کے حوالے اتنا اہم کام کیا گیا تھا انھیں ربّ العالمین نے اولوالعزم کہہ کے یاد کیا ہے۔ یہ وہ باہمت افراد تھے جن کے عزم کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ حوصلہ مند شخصیتیں تھیں جن کے ارادوں کے سامنے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ عزمِ نوحؑ گواہ ہے کہ پتھر میں دب جانا ممکن ہے، تبلیغ کا چھوڑ دینا ممکن نہیں۔ عزمِ ابراہیمؑ گواہ ہے کہ آگ میں کود پڑنا ممکن ہے توحید کا پیغام ترک کر دینا ممکن نہیں۔ عزمِ موسیٰؑ پکار رہا ہے کہ نیل کی موجوں سے کھیلنا آسان ہے دینِ خدا سے کھیلنا مشکل ــــ عزمِ عیسیٰؑ اعلان کر رہا ہے کہ "زعمِ باطل میں" تختۂ دار کا سامنا آسان ہے لیکن کارِ ہدایت کا

ترک کر دینا مشکل ۔ اور عزم سرکارِ دو عالمؐ آواز دے رہا ہے کہ پتھر، آگ، پانی، سولی کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا انبیاء سابقین کا کام تھا اور یہاں تو حوصلوں کی وہ منزل ہے کہ اگر ایک ہاتھ پر آفتاب رکھ دیا جائے اور دوسرے ہاتھ پر ماہتاب رکھ دیا جائے تو بھی ارادوں میں فرق نہیں آسکتا اور تبلیغ کے کاموں میں رکاوٹ نہیں پیدا ہو سکتی ۔

مرسلِ اعظمؐ کا یہی حوصلہ اور حبیبِ خدا کا یہی مستحکم ارادہ تھا جس پر مالک کو بھی پیار آگیا۔ اور اُس نے آواز دی " اَحۡسَنۡتَ " میرے حبیبؐ ۔ مرحبا میرے محبوب ۔ اگر تو نے میرے مقصد کے لیے اتنی بڑی قربانی کا عزم کر لیا ہے تو لے میں بھی تجھ سے وعدہ کیے لیتا ہوں

" وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ "

" تو دین کی تبلیغ کرتا جائے گا اور میں تیری حفاظت کرتا جاؤں گا ۔"

یاد رکھیے ! پیغامبری کی دشواریوں ہی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس پیغام کا تحفظ کس قدر دشوار اور کس قدر مشکل ہے ۔ اس لیے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدِمقابل پیغام کی عظمت یا اس کے ماننے والوں کی طاقت کو دیکھ کر وقتی طور پر چپ ہو جاتا ہے اور اس موقع کا انتظار کیا کرتا ہے جب یہ شیرازہ منتشر ہو جائے اور اسے دوبارہ پیغام کو مٹانے اور رسالت پر حملہ کرنے کا موقع مل جائے ۔ اُحد کی لڑائی اس بات کی زندہ گواہ ہے کہ باطل کبھی چین سے نہیں بیٹھا کرتا ۔ اس کے ذہن میں ہمیشہ حق کو پامال کرنے کی تدبیریں رہتی ہیں ۔ اور وہ اپنے موقع کا منتظر رہتا ہے ۔

یہ بات واضح ہو جائے تو ائمہ معصومینؑ کی زحمتوں کا بھی صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ جہاں باطل ایک مدّت تک خاموش بیٹھنے کے بعد پھر منظرِ عام پر آیا ہے اور ابوسفیان کی اولاد محمدؐ عربی کے فرزند سے بیعت لینا چاہتی ہے۔ یاد رکھیے یہ یزید، حسینؑ بن علیؑ سے مطالبۂ بیعت نہیں کر رہا ہے۔ کفر، اسلام سے اپنا انتقام لے رہا ہے۔ باطل، حق سے اعلانِ جنگ کر رہا ہے۔ وقتی خاموشی شور طوفان سے بدل رہی ہے اور وقت آگیا ہے کہ کوئی مردِ مجاہد اُٹھ کر رسالت کی حفاظت کرے اور یزید پر واضح کر دے کہ تو نے محمدؐ عربی کے عزم کو نہیں دیکھا ہے محمدؐ کے نواسے کا عزم دیکھ لے ــــ اگر دین کی حفاظت کے لیے مجھے سر بھی دینا پڑے گا تو سر دے دوں گا لیکن عزّتِ دین کو برباد نہیں ہونے دوں گا۔

دین و شریعت کے تحفّظ کا یہی عزم تھا جس نے حسینؑ بن علیؑ کو ایک خاص طرز کے اصحاب کو جمع کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حسینؑ جانتے تھے کہ میں نانا کی طرح بیشمار اصحاب اور بابا کی طرح بکثرت انصار جمع کر سکتا ہوں۔ اہلِ دنیا میرے ساتھ بھی آنے کے لیے بیچین ہیں لیکن آپ ہر قدم پر واضح کر دینا چاہتے تھے کہ اب دین کو اصحاب و انصار کی ضرورت نہیں ہے۔ اب لشکر و فوج کی منزلیں گذر چکی ہیں۔ اب سر کٹانے والے جاں نثار اور تلواروں کی دھاروں پر چلنے والے مجاہدین کی ضرورت ہے۔ اسی لیے آپؑ نے قدم قدم پر ساتھیوں کو آواز دی کہ جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ اس راہ میں مصائب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہاں سر کٹانے کا مرحلہ اور گھر لٹانے کی منزل ہے

خدا جانتا ہے کہ اس عزم کا سردارِ لشکر آج تک دیکھنے میں نہیں آیا —
دنیا کے سردارانِ لشکر وقتِ آخر تک فوجوں کو کامیابی کا یقین دلاتے رہتے
ہیں اور لڑنے والوں کو یہی سمجھاتے رہتے ہیں کہ آخری فتح ہماری ہے، کامیابی
ہمارے ہی قدم چومے گی۔ تخت و تاج ہمارے ہی قدموں میں رہیں گے لیکن
حسینؑ ہر ہر قدم پر یہ واضح کرتے جاتے تھے کہ جانا ہے تو چلے جاؤ —
یہاں نہ تخت ہے نہ تاج۔ نہ حکومت ہے نہ اقتدار — نہ مالِ
غنیمت ہے نہ آب و دانہ۔

خدا جانے وہ کیسے حوصلہ مند اور باوفا اصحاب تھے جو ایسے حالات
میں بھی امام حسین علیہ السلام کے قدموں سے لپٹے رہے۔ اور ایک لمحہ کے
لیے فرزندِ رسول کو چھوڑنا گوارہ نہیں کیا۔ موت آتی ہے تو آ جائے گلے کٹتے
ہیں تو کٹ جائیں۔ گھر لٹتا ہے تو لٹ جائے لیکن فرزندِ رسولؐ کا ساتھ
نہیں چھوٹے گا۔ حیرت ان پر نہیں ہے جو حسینؑ کے ساتھ تھے اور ایسے حالات
میں رہ گئے۔ حیرت اُن کی وفا پر ہے جو اپنے گھر میں چین سے بیٹھے ہوئے تھے
اور ان حالات کی خبر سنتے ہی کربلا کے لیے روانہ ہو گئے۔

کیا تاریخ اس واقعہ کو بھلا دے گی کہ حبیب ابنِ مظاہر اپنی زوجہ
کے ساتھ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ کتنا پُرسکون ماحول تھا اور
کتنے اطمینانی حالات کہ ایک مرتبہ کسی نے دَقُّ البَابُ کیا۔ حبیب نے
گھبرا کر پوچھا، کون؟ آنے والے نے کہا۔ "اَنَا بَرِیْدُ الْحُسَیْنؑ"۔ میں
حسینؑ کا قاصد ہوں۔ حسینؑ کا نام سُنا۔ دسترخوان چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

ارے، میرے آقا کا نامہ بر آیا ہے۔ میرے شہزادے کا خط لایا ہے۔ میرے مولا نے مجھے یاد کیا ہے ـــــ دوڑ کر دروازہ پر آئے۔ دروازہ کھولا فرطِ محبت سے لفافہ کو لیکر چاک کیا۔ دیکھا لکھا ہوا ہے:

"یہ خط حسینؑ بن علیؑ کا ہے ایک مردِ فقیہہ حبیب بن مظاہر کے نام۔ اے حبیب! ہم دشمنوں میں گھر گئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم ہماری مدد کو آؤ"

خط پڑھا۔ دل تڑپ گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اللہ! رسولؐ کا نواسہ اور نرغۂ اعداء میں ـــ فاطمہؑ کا لال اور دشمنوں میں ـــ علیؑ کا نورِ نظر اور عالمِ غربت و مسافرت میں۔ سر جھکائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے زوجہ نے چہرہ کی اُداسی میں خط کا مضمون پڑھا اور گھبرا کر کہا ـــ حبیب! مولا نے کیا لکھا ہے؟

حبیب نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ فرزندِ رسولؐ نرغۂ اعداء میں گھر گیا ہے، مجھے مدد کے لیے بُلایا ہے۔

زوجہ نے تڑپ کر پوچھا پھر کیا ارادہ ہے۔؟ حبیب نے کہا ـــ سوچ رہا ہوں کہ ان مصائب میں جاؤں یا نہ جاؤں۔

زوجہ نے کہا۔ افسوس، رسولؐ کا نواسہ بُلا رہا ہے اور تم سوچ رہے ہو۔

حبیب نے کہا۔ مومنہ! تیرا خیال بھی تو ہے کہ تجھے کس پر چھوڑ کے جاؤں گا۔

زوجہ نے منہ پیٹ لیا۔ اللہ۔ تمھیں میرا خیال ہے اور فاطمہؑ زہرا کا خیال نہیں ہے۔ حبیب نے زوجہ کو تسکین دی ـــ مومنہ میرا جانا بیحد ضروری ہے میں ضرور جاؤں گا۔ چاہتا تھا کہ اس راہ میں تیرے جذبات کا بھی اظہار ہو جائے۔

اچھا، اگر تیرا ابھی یہی حوصلہ ہے تو جاتا ہوں۔ اب شاید پلٹ کر آنا نصیب نہ ہو۔ زوجہ نے کمالِ محبّت سے رُخصت کیا۔ جاؤ خدا کے حوالہ کیا۔ دیکھو! میرا خیال نہ کرنا۔ میں اپنا سہاگ لُٹانے کے لیے تیار ہو گئی۔ بس کوشش کرنا کہ میرے مولا پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ زوجۂ حبیب کے جذبات نے نہ جانے کیا کیا کہا، اور حبیب نہ جانے کیا کیا ارادے لیکر چلے۔ گھر سے نکل کر غلام کو بُلایا۔ حالاتِ زمانہ کو دیکھ کر غلام سے کہا۔ تو میرے گھوڑے کو لیکر چل اور فلاں مقام پر میرا انتظار کرنا۔ میں باغات کی طرف سے ہوتا ہوا آ رہا ہوں۔

غلام گھوڑے کو لے کر چلا اور ایک مقام پر کھڑا ہو گیا۔ ادھر حبیب کے آنے میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ قریب پہونچے تو کیا دیکھا کہ گھوڑے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور غلام کہہ رہا ہے: اے اسپ باوفا! اگر میرا مالک نہ آیا تو میں تیری پشت پر سوار ہو کر فرزندِ رسولؐ کی مدد کو جاؤں گا۔

حبیب نے کلیجہ پکڑ لیا۔ دل نے آواز دی۔ فاطمہؑ کے لال! اب آپؑ کے مصائب اس منزل پر پہونچ گئے ہیں کہ غلام جان قربان کرنے کے لیے تیار ہیں اور جانور آنسو بہا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر قریب پہونچے، غلام کے ہاتھ سے لجامِ فرس کو لیا۔ گھوڑے پر سوار ہوے۔ غلام کی طرف رُخ کر کے آواز دی: جا میں نے تجھے راہِ خدا میں آزاد کیا۔ غلام نے قدم تھام لیے۔ آقا! یہ کیسا انصاف ہے؟ جب تک آپ کی خدمت کا معاملہ تھا، آپ نے مجھے ساتھ رکھا، اور اب جو فرزندِ رسولؐ کی خدمت کا

موقع آیا تو مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ یہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔ اور میں آپ کے ہمراہ چلوں گا۔

حبیب نے غلام کو ساتھ لیا اور تیزی کے ساتھ بڑھے، ایسا نہ ہو کہ پہونچنے میں تاخیر ہو جائے اور فرزندِ رسولؐ کی بارگاہ میں شرمندہ ہونا پڑے۔

منزل سے قریب پہونچے تو دل مطمئن ہو گیا کہ مولا کی بارگاہ قریب ہے اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

اُدھر کوفہ کی جانب سے اڑتی ہوئی گرد کو دیکھتے ہی فرزندِ رسولؐ نے اصحاب کو حکم دیا: بڑھو! بڑھو! استقبال کرو ـــ میرا بچپن کا جاں نثار حبیب آ رہا ہے۔

اصحاب بڑھے۔ حبیب کا استقبال کیا۔ حبیب مولا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اب جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ مولا نرغۂ اعدا میں ہیں اور چاروں طرف خون کے پیاسے ہیں۔ بچے پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔

دل سنبھالا۔ قربانی پر تیار ہوئے۔ امامؑ کے سکون کو دیکھ کر اصحاب میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی ـــ ادھر خیمہ میں یہ خبر پہونچی کہ کوئی آیا ہے۔

ثانیٔ زہراؑ نے فضّہ سے کہا ـــ فضّہ! دیکھو کون آیا ہے؟

فضّہ دوڑ کر درِ خیمہ پر آئی اور پلٹ کر خبر سُنائی۔ شہزادی! مبارک ہو، آپؑ کے ماں جائے کا بچپن کا ساتھی حبیب آیا ہے۔ یہ سُننا تھا کہ زینبؑ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــ فضّہ! جلدی جا اور جا کر حبیب سے

میرا اسلام کہنا۔ کہنا حبیب! تم نے بڑا احسان کیا جو ایسے وقت میں میرے مانجائے کی مدد کو آ گئے۔ فضہ نے آ کر شہزادی کا پیغام سُنایا۔ حبیب تڑپ گئے ۔۔ خاک پر بیٹھ گئے ۔۔ منھ پر طمانچے مارنا شروع کیے ۔۔ اللہ، اب وہ وقت آ گیا ہے کہ: دخترِ زہراؑ غلام کو سلام کہلوا رہی ہیں، اور اس کا احسان مان رہی ہیں۔

عزادارو! یہ حبیب تھے جنھوں نے زینبؑ کے سلام کی یہ قدر کی ۔۔ اب ایک سلام آپ کے نام بھی ہے ۔۔ پہچانا آپ نے کون سا سلام جب حسینؑ رخصتِ آخر کے بعد چلنے لگے تو بیمار بیٹے سے فرمایا۔ میرے لال! جب قیدِ شام سے چھوٹ کر مدینے جانا تو ہمارے شیعوں سے ہمارا اسلام کہہ دینا ۔۔ اور کہنا شیعو! جب ٹھنڈا پانی پینا تو میری پیاس کو یاد کر لینا اور جب کسی غریب و شہید کا ذکر آ جائے تو مجھ پر آنسو بہانا

واحسینا ۔۔ واحسینا ۔۔

رونے والو! آؤ ہم سب مل کر فرزندِ رسولؐ کو جوابِ سلام دیں اور عرض کریں۔ آدمؑ کے وارث! تجھ پر سلام ۔۔ نوحؑ کے وارث تجھ پر سلام ۔۔ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے وارث تجھ پر سلام ۔۔ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے وارث تجھ پر سلام ۔۔ محمدؐ کے لال تجھ پر سلام ۔۔ علیؑ کے نورِ نظر تجھ پر سلام ۔۔ فاطمہؑ کے پارۂ دل تجھ پر سلام ۔۔

سلام اُس سرِ اطہر پر جو نوکِ نیزہ پر بلند کیا گیا ۔۔ سلام اُس

جسمِ اقدس پر جو خاکِ کربلا پر پڑا رہا ــــ سلام اُس گلوئے مبارک پر جسے کُند خنجر سے کاٹا گیا ــــ سلام اُس سینۂ اطہر پر جس پر شمر نے قدم رکھے ــــ سلام اُس لاشِ مطہّر پر جسے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا گیا ــــ سلام اُن لبہائے نازنین پر جو وقتِ آخر بھی بخششِ اُمّت کی دُعائیں کرتے رہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَآءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِى الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى اَعْدَآئِهِمْ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ الْحَكِيْمُ فِىْ كِتَابِهِ الْكَرِيْمِ

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ"

ارشادِ جنابِ اقدسِ الٰہی ہے۔ "محمدؐ صرف اللہ کے رسول ہیں۔"

مالکِ کائنات نے اپنے حبیبؐ کے تعارف میں دو لفظیں استعمال کی ہیں۔ ایک محمدؐ اور ایک رسول۔ بظاہر تو یہ دو لفظیں ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ آئینہ کے دو رُخ ہیں جن میں مرسلِ اعظمؐ کی پوری زندگی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ مالکِ کائنات نے قبلِ خلقتِ آدمؑ عالمِ نبوت

سے سرفراز کرنے کے بعد اپنے حبیب کو اِس دنیا میں بھیجا اور مرسلِ اعظمؐ نے جب بھی اس دنیا میں قدم رکھا، رسالت آپؐ کے ساتھ ساتھ تھی۔ بعثت پیغمبرؐ رسالت کا اعلان ہے، رسالت کی عطا نہیں ہے۔ بعثت رسالت کی عطا کیوں نہیں ہے اور اعلانِ رسالت سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟ ان تفصیلات کا موقع نہیں ہے۔

اِس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ رسالت کے اس عظیم عہدہ پر فائز ہونے کے بعد بھی حضور سرورِ کائناتؐ نے جب اس دنیا میں قدم رکھا تو بشر ہی کے بھیس میں آئے۔ آپؐ کے جسمِ اقدس پر بشریت ہی کا لباس زیبا معلوم ہوا۔ آپؐ کو دنیائے انسانیت و آدمیت ہی کی ایک فرد بنا کر بھیجا گیا۔ جس کے بعد آپؐ کی زندگی میں دو پہلوؤں کا پیدا ہو جانا ضروری تھا آپؐ بشر بھی تھے اور رسول بھی۔ آدمی بھی تھے اور نبی بھی۔ انسان بھی تھے اور نمائندۂ رحمٰن بھی ـــ آدمیت کے اعتبار سے سارے انبیاءؑ کے بعد دنیا میں تشریف لائے اور نبوّت کے اعتبار سے قبلِ آدمؑ بھی نبی تھے۔ بشریّت کے اعتبار سے اولادِ آدمؑ میں شمار ہوتے تھے اور رسالت کے اعتبار سے کائنات کا ایک جزء تھے۔ اور روحانی کمالات کے اعتبار سے پوری کائنات کی روح وجان ـــ اور خلقتِ کون ومکان کی اصل وعلّت

"لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ"

(محمدؐ اگر تم نہ ہوتے تو یہ کائنات نہ ہوتی)

میں نے اس کائنات میں جو کچھ پیدا کیا ہے سب تمہارے ہی صدقے میں

پیدا کیا ہے۔

یہ بشریت ہی تھی جو آپؐ کو اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے اور چلنے پھرنے پر آمادہ کرتی تھی۔ اور آپؐ دنیا کے دوسرے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ روٹی، کپڑا، مکان آپ کے بھی بنیادی ضروریات میں شامل تھے۔ اور آپؐ نے ظاہری زندگی اس سادہ انداز سے گذاری کہ کفار کو کہنے کا موقع مل گیا کہ ـــ "ہم اسے نبی نہیں مانیں گے جو بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے اور کھانا بھی کھاتا ہے۔"

وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ نبوّت و رسالت کھانے پینے کی محتاج نہیں ہے لیکن انسانی زندگی کے لیے یہ چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور محمدؐ جہاں رسول ہیں وہاں بشر بھی ہیں ـــ انسان بھی ہیں اور اولادِ آدمؑ میں بھی ہیں۔

اسی نکتہ کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآنِ حکیم نے مرسلِ اعظمؐ کی رسالت کا اعلان ان لفظوں میں کیا تھا:

"هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ"

"وہ خدا وہ ہے جس نے مکّہ والوں میں ایک رسول بھیجا جو انھیں میں سے تھا۔"

غور کرنے کی بات ہے کہ پیغمبر، رسول بھی تھا، اور انھیں میں سے تھا ـــ ظاہر ہے کہ مکّہ والے سب رسول نہیں تھے کہ رسول انھیں میں سے ہوتا بلکہ اس کا کھلا ہوا مقصد یہ ہے کہ ہمارا حبیبؐ رسولؐ ہونے کے باوجود مکّہ والوں ہی میں سے تھا۔ رسول ہونا اس کا روحانی کمال ہے اور مکّی

ہونا اُس کے جسم کا تقاضا ہے۔ جب جسم رکھتا ہے تو جسم کسی نہ کسی مکان میں رہے گا اور جب مکان مقرر ہو جائے گا تو وطن کا رشتہ خود بخود پیدا ہو جائے گا۔

اس حقیقت کے ماننے میں کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے کہ نبی کی زندگی میں دو پہلو ہیں، ایک بشریّت اور ایک رسالت ــــ ایک آدمیّت اور ایک خاتمیّت ــــ لیکن قابلِ توجّہ بات صرف یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو کسی وقت بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا نا ممکن ہے کہ کھاتے پیتے وقت بشر رہیں اور رسالت ختم ہو جائے ــــ اور نزولِ وحی کے وقت رسول رہیں اور بشریّت تمام ہو جائے ــــ نہیں نہیں یہ زندگی کے ہر لمحہ میں ــــ حیاتِ مادّی کے ہر موڑ پر بشر بھی ہیں اور رسول بھی ــــ حد یہ ہے کہ یہ کسی کی تعظیم کو اُٹھتے ہیں ــــ کسی کو دوش پہ جگہ دیتے ہیں ــــ کسی کے لیے ناقہ بن جاتے ہیں تب بھی رسول رہتے ہیں ــــ اور معراج کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے "قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى" کی منزل تک پہونچ جاتے ہیں تو بھی بشر ہی رہتے ہیں۔

معراجِ جسمانی کا انکار کرنے والے مسلمان اسی غلط فہمی میں پڑے رہ گئے کہ رسالت کی زندگی الگ ہوتی ہے، اور بشریّت کی زندگی الگ اور مالک کائنات نے مادّی جسم کے ساتھ عرشِ اعظم پر بُلا کر یہ واضح کر دیا کہ ان کی زندگی میں نہ بشریّت، رسالت سے الگ ہے نہ رسالت بشریّت سے۔

مختصر یہ ہے کہ یہ ایک ایسا رسول ہے جس کی رسالت بشریّت کے سانچہ میں ڈھال دی گئی ہے۔ اور ایک ایسا بشر ہے جس کی بشریّت کا خمیر

رسالت سے اُٹھایا گیا ہے۔

بشریّت اور رسالت کے دونوں پہلو اس بات کا تقاضا کر رہے تھے کہ مالکِ کائنات دونوں منزلوں میں اپنے حبیب کی عظمت کا اعلان کرے اور دنیا کو بتائے کہ یہ بشریّت کے اعتبار سے کتنا پاکیزہ کردار ہے اور منصب کے لحاظ سے کتنا بلند مرتبہ۔

شاید یہی وجہ تھی کہ مالک کائنات نے اپنے حبیب کے تعارف میں دو لفظیں استعمال کیں۔ ایک محمدؐ اور ایک رسولؐ۔ محمدؐ یعنی قابلِ تعریف و توصیف۔ رسول، یعنی تبلیغِ دین و شریعت کا ذمّہ دار۔ ایک ذاتی کردار کی طرف اشارہ ہے اور ایک منصبی فرائض کی طرف۔ گویا قدرت یہ بتانا چاہتی ہے کہ میرا حبیب بشری کردار کے اعتبار سے محمدؐ ہے۔ اور منصبی فرائض کے اعتبار سے رسول ــــ اب جتنا محمدّیت پر غور کرتے جاؤ گے اس کی ذاتی زندگی کے کمالات کھُلتے جائیں گے۔ اور جتنا رسالت کو پہچانتے جاؤ گے اس کی معنوی بلندی نگاہوں کے سامنے آتی جائے گی۔

ضرورت ہے کہ ان دو لفظوں کی مکمّل معنویت پر غور کیا جائے، تاکہ پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی کا پورا خاکہ نگاہوں کے سامنے آجائے۔ لفظ رسول کے بارے میں پھر کبھی بحث کی جائے گی ــــ آج صرف لفظِ محمدؐ کی شرح مقصود ہے۔

یاد رکھیں لفظِ محمدّ عربی زبان کا لفظ ہے جو حمد سے بنایا گیا ہے۔ حمد کے معنی ہیں اختیاری کمالات پر تعریف کرنا۔ اسی حمد سے محمود

بھی نکلا ہے اور محمدؐ بھی ـــــ محمود کے معنی ہیں جس کی تعریف کی جائے اور محمدؐ کے معنی ہیں جس کی بہت زیادہ تعریف کی جائے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مالک کائنات نے اپنا نام محمود رکھا ہے ـــــ اور اپنے حبیب کو محمدؐ کہا ہے ؟ بندہ کبھی اتنی تعریف کے لائق ہو ہی نہیں سکتا جتنا لائقِ تعریف معبود اور مالک ہے ـــــ پھر کیا وجہ ہے کہ اپنے کو لائقِ تعریف کہا ہے اور اسے بہت زیادہ لائقِ تعریف ـــــ اس کے نہ کمالات مالک کے برابر ہو سکتے ہیں اور نہ اختیارات ـــــ بندہ پھر بندہ ہے اور مالک پھر مالک ـــــ بندہ کے پاس جو کچھ ہے سب مالک ہی کا دیا ہوا ہے

جہاں تک میں نے غور کیا ہے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ حمد خدا کی بھی ہوتی ہے اور محمدؐ مصطفے کی بھی ـــــ لیکن دونوں کی تعریف میں ایک نمایاں فرق ہے اور وہ یہ کہ خدا کی جتنی بھی حمد ہوتی ہے سب میں قابلِ حمد خدا ہے اور حمد کرنے والے بندے اور محمدؐ عربی کی جو تعریف ہوتی ہے اس میں قابلِ تعریف بندہ ہے اور تعریف کرنے والا خدا ـــــ گویا مالک اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ دیکھو تعریف میری بھی ہوتی ہے اور اس کی بھی، لیکن فرق یہ ہے کہ میری تعریف کرنے والے بندے ہیں اور اس کی تعریف کرنے والا میں ہوں ـــــ اور یہی فرق ہے کہ جس کی تعریف بندے کرتے ہیں وہ محمود ہوتا ہے اور جس کی تعریف خدا کرتا ہے وہ محمدؐ ہوتا ہے۔

پہچانا آپ نے کہ اس نامِ محمدؐ میں کیا کمالات ہیں ـــــ یہ نام نہیں ہے مالک کی طرف سے بے حد وانتہا قابلِ تعریف ہونے کی سند ہے

یہ نام نہیں ہے اس بات کا اعلان ہے کہ اس بندہ کی تعریف میں خود مالک بھی "رطب اللسان" ہے۔

ظاہر ہے کہ جسے خدا قابلِ حمد وثنا بنائے گا اُس کی زندگی کیسی ہوگی اور اس کا کردار کیا ہوگا ــــ بلکہ مجھے تو اہلِ عربیت سے پوچھنا ہے کہ حمد کا استعمال "اختیاری کمالات کی تعریف" کے بارے میں ہوتا ہے اور کائنات کا اختیار صرف مالک کے ہاتھ میں ہے اور اسی لیے سب کیلئے مدح کا استعمال ہوتا ہے اور خدا کے لیے حمد کا ــــ تو خود خدا نے بندہ کے لیے اس لفظ کا استعمال کیوں کیا۔؟ کیا اسے زبان کی ان نزاکتوں کی اطلاع نہیں ہے۔ کیا معاذ اللہ وہ عربی زبان کے خصوصیات سے باخبر نہیں ہے؟ ــــ اہلِ ادب جواب دیں گے، نہیں۔ اس نے ان تمام نکات کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اپنے حبیب کو نامِ محمدؐ سے نوازا ہے تو اب مجھے کہنے دیجیے کہ یہ نام صرف کردار کی پاکیزگی کا اعلان نہیں ہے بلکہ اس بات کا بھی اعلان ہے کہ میں نے کُل کائنات کا اختیار بھی اپنے حبیبؐ کو دے دیا ہے۔ صاحبِ اختیار نہ بنایا ہوتا تو اسے ممدوح کہتا۔ محمدؐ نہ کہتا۔ محمدؐ اسی لیے کہا ہے کہ تم ایک لفظ سے اس کے کردار کا بھی اندازہ کرلو اور اس کے اختیارات کی حدود کا بھی پتہ لگالو ــــ یہ بلندیوں کی اس منزل پر ہے جہاں نہ کردار کی عظمت سمجھ میں آتی ہے اور نہ اختیارات کی وسعت۔ پاکیزگیٔ کردار کا یہ عالم ہے کہ خدا سے لیکر دشمن تک سب تعریف کرتے ہیں اور وسعتِ اختیار کی یہ کیفیت ہے کہ ذرّاتِ زمین سے

لے کر عرشِ اعظم تک سب اس کے زیرِ قدم رہتے ہیں۔

یہاں تک پہونچنے کے بعد میں اہلِ اسلام سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اور مجھے ان کی غیرتِ اسلامی کو چیلنج کرنا ہے — مسلمانو! تم نے تو اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر صبح و شام اقرار کیا:

" اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ " (ساری حمد اللہ کے لیے ہے)

یہ تم نے کسی بندہ کو لائقِ حمد اور محمّد کیسے مان لیا۔؟ کیا الحمد للہ کہتے وقت حمد کا کچھ حصّہ بچا لیا تھا جسے نبوّت کی منزل میں صَرف کر دیا۔ یا تمھارے کردار کا یہی انداز ہے کہ خدا کے سامنے جاؤ تو کہو، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ "ساری تعریف تیرے لیے ہے"۔ اور بندے کے سامنے جاؤ تو کہو: " محمّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ " یعنی میرے سرکار آپ بھی محمّد اور مستحقِ حمد ہیں۔

خدا جانتا ہے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر غور و فکر کرنا دنیائے اسلام کا ایک فرض ہے۔ اور الحمد للہ کہلوانے والے خدا نے اپنے بندہ کا نام محمّدؐ اسی لیے رکھ دیا ہے کہ امّتِ اسلامیہ اس مسئلہ پر غور کرے اور سوچے کہ ان دونوں کا اجتماع کیونکر ہو گا اور دونوں نظریات ایک نقطہ پر کس طرح جمع ہوں گے۔

یاد رکھیے کہ اگر مرسلِ اعظمؐ کو محمّدؐ خود خدا نے نہ کہہ دیا ہوتا تو اس نام سے یاد کرنا ایک طرح کا شرک ہو جاتا، اور کوئی مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان نہ رہ جاتا۔ یہ مالک کا رحم و کرم تھا کہ اس نے خود ہی اپنے بندہ

کا نام محمدؐ رکھ دیا اور اس طرح ذہنوں کو ایک راستہ مل گیا، اور مسئلہ کا ایک مستقل حل نکل آیا۔

مالکِ کائنات یہ بتانا چاہتا ہے کہ میرے بندے تیرا فرض ہے کہ تو الحمد للہ کہہ کر ساری حمد و ثنا میرے حوالے کر دے۔ تجھے اپنے پاس کچھ رکھنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے بعد مجھے اختیار ہے کہ میں جسے چاہوں گا حوالے کر دوں گا۔ اور جب تو نے ساری حمد کی میری ملکیت ہونے کا اقرار کر لیا تو اب تجھے یہ بتاتا ہوں کہ میں نے یہ حمد اپنے بندہ محمدؐ کے حوالے کر دی ہے ۔۔۔ تو نے میری حمد کی تو کہا الحمد للہ ۔۔۔ میں نے اسے حمد دیدی تو کہا:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ

اب اس فلسفہ کو یاد رکھنا ۔۔۔ کہ الحمد للہ کے بعد تمہیں کسی کو لائقِ حمد و ثنا، بنانے کا حق نہیں ہے اور یہ حق صرف مالکِ کائنات کا ہے وہ جسے چاہے قابلِ تعریف بنا دے۔ بندہ کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ جس کی تعریف کر دے اُس کی تعریف کرتا رہے اور جسے بُرا کہہ دے اُسے بُرا کہتا رہے۔ اپنے پاس سے کسی فیصلہ کا اختیار نہیں ہے۔ وہ کسی کو نبی کہے تو نبی کہو ۔۔۔ ولی کہے تو ولی کہو۔ امام و خلیفہ کہے تو امام و خلیفہ کہو ۔۔۔ اور لعنت و برأت کا مستحق قرار دے تو اس کا بھی اظہار کرو۔

مرسلِ اعظمؐ کے اسمِ گرامی کے بارے میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے

کہ یہ نام مالکِ کائنات کا عطا کیا ہوا ہے اور اسی نے اپنے حبیبؐ کو اس عظیم لقب سے سرفراز فرمایا ہے۔ اور نام جب کسی عام انسان کی طرف سے ہوتا ہے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ بہت سے بہت ایک فالِ نیک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اچھا نام یہ سمجھ کر رکھا جاتا ہے کہ بچہ مستقبل میں اچھے کردار کا مالک ہوگا۔ علیؑ و محمدؐ نام رکھنے سے کوئی علیؑ و محمدؐ نہیں ہو جاتا، لیکن یہ اُمید ضرور رہتی ہے کہ علیؑ و محمدؐ نہیں ہو سکتا تو کم از کم اُن کا پیرو اور فرمانبردار ضرور ہوگا ۔۔۔ لیکن یہی نام جب کسی عالم الغیب ہستی کی طرف سے ہوتا ہے تو اس کی حیثیت شگون کی نہیں ہوتی، بلکہ اس میں مستقبل کے کردار کی ضمانت ہوتی ہے اور یہ شکل پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر اس کا کردار نام کے مطابق ہونے والا نہیں تھا تو آپ نے مستقبل سے باخبر ہونے کے باوجود یہ نام کیوں رکھا ۔۔۔ ایسے حالات میں اپنے علم کی لاج رکھنے کے لیے عالم الغیب کی ذمّہ داری ہوتی ہے کہ وہ کردار کو دیکھ کر نام مقرّر کرے تاکہ اپنے علم کے دامن پر دھبّہ نہ آنے پائے۔

مالکِ کائنات عالم الغیب ہے۔ وہ مستقبل کے حالات سے باخبر ہے ۔۔۔ ہر شے کا مستقبل اس کے ہاتھوں میں ہے اور اس نے اپنے حبیبؐ کا نام محمدؐ رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پیغمبرؐ کی پوری زندگی کا جائزہ لے لیا ہے۔ اور اس کے بعد انھیں محمدؐ قرار دیا ہے ۔۔۔ اب یہ نام صرف نام نہیں ہے بلکہ ایک

ضمانت اور ذمّہ داری ہے کہ اس کی پوری زندگی محمدؐ ہے۔ یہ اُٹھے تو محمدؐ ہے۔ بیٹھے تو محمدؐ ہے۔ سوئے تو محمدؐ ہے جاگے تو محمدؐ ہے۔ بندگی کرے تو محمدؐ ہے۔ مزدوری کرے تو محمدؐ ہے۔ بزمِ اصحاب میں رہے تو محمدؐ ہے ــــ اور عرشِ اعظم کی سیر کرے تو محمدؐ ہے ــــ

مرسلِ اعظمؐ کے اسمِ گرامی کے سلسلے میں ایک نکتہ یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ مالک نے اپنے حبیبؐ کے دو نام رکھے ہیں۔ جنابِ عیسیٰؑ کے ذریعہ یہ اعلان کرایا ہے کہ میرے بعد آنے والے نبی کا نام احمد ہوگا۔ اور ہم سے یہ بتایا ہے کہ ہمارا یہ حبیب محمدؐ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دو نام کیسے ؟ ــــ اور اس نام بدلنے کا فلسفہ کیا ہے۔؟ کیا یہ نبی وہی نہیں ہے جس کی خبر عیسیٰؑ نے دی تھی ــــ کیا پروردگار کو یہ یاد نہیں رہا کہ اس نے عیسیٰؑ کی زبان سے احمد نام بتایا ہے ــــ کیا جناب عیسیٰؑ نے صحیح نام نہیں بتایا تھا ــــ نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ احمدؐ بھی ہے اور محمدؐ بھی، اور اس کا نکتہ اس وقت ظاہر ہوگا جب دونوں کے معنی پر غور کیا جائے گا۔

یاد رکھیے ! عربی زبان میں احمد کے معنی ہیں بہت زیادہ تعریف کرنے والا ــــ اور محمدؐ کے معنی ہیں جس کی بہت زیادہ تعریف کی جائے یہ رسول احمدؐ بھی ہے اور محمدؐ بھی ــــ فرق یہ ہے کہ دنیا میں آنے سے پہلے احمدؐ تھا، اور آیا، تو محمدؐ بن کر ــــ سمجھے آپ ! یہ کیا انقلاب ہوگیا اور مالک نے کس عظیم کردار کی طرف اشارہ کردیا۔ حقیقتاً قدرت

یہ بتانا چاہتی ہے کہ بندے نے عالمِ ظاہر میں قدم رکھنے سے پہلے عالمِ انوار میں اتنی زیادہ حمد کی ہے کہ ہم نے اُسے قابلِ حمد و ثناء بنا دیا ہے۔ کَل جب یہ ہماری حمد کر رہا تھا تو احمد تھا ـــــ آج جب ہم نے اسے قابلِ حمد و ثناء بنا دیا ہے تو محمدؐ ہو گیا ہے۔

لائے دنیا کوئی ایسا انسان جسے مالک نے یہ شرف بخشا ہو اور پیش کرے کوئی ایسا کردار جسے یہ بلندیاں نصیب ہوں۔ یہ عظمتیں تو صرف محمدؐ کے گھرانے میں دیکھی ہیں جہاں ایک حسنِ کردار میں محمدؐ ہے تو دوسرا بلندیوں میں علیؑ ـــــ ایک اپنے اقدام میں حسنؑ ہے تو دوسرا اپنے عمل میں حسینؑ۔ جو ہے وہ صاحبِ عظمت ـــ جو ہے وہ صاحبِ کردار اور کردار میں بھی ایسی یگانگت اور یکسانیت کہ جسے دیکھا محمدؐ ہی نظر آیا اوّل بھی محمدؐ، اوسط بھی محمدؐ، آخر بھی محمدؐ اور کُل کے کُل محمدؐ۔

معصوم تو معصوم، اس گھر میں ایسے غیر معصوم بھی ملتے ہیں جنھوں نے آغوشِ عصمت میں تربیت پانے کے بعد اپنے کو عظمتِ کردار کی اس منزل پر پہونچا دیا ہے جہاں تک عام انسانوں کو پہونچنا دشوار بلکہ ناممکن ہے ـــ وہ صاحبِ عصمت علیؑ تھے جنھوں نے میدانِ جنگ میں اعلان کیا تھا۔ ابوطالب کے لال کو موت سے اتنا ہی اُنس ہے جتنا بچّہ کو شیرِ مادر سے ہوتا ہے اور یہ کمسن شہزادہ قاسمؑ ہے جو اعلان کر رہا ہے چچا موت شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے۔

کیا تاریخ میں کبھی ایسے بچّے بھی ملے ہیں جو موت کے لیے تڑپ رہے

ہوں اور تلواروں سے کھیلنے کے لیے بیچین ہوں۔ یہ حسینؑ ہی کے لشکر کا خاصّہ ہے جہاں ایک ایک بچّہ موت کی گودی میں کھیلنے کے لیے بیچین اور ایک ایک جوان عروسِ موت سے ہمکنار ہونے کے لیے بیتاب ہے۔

تاریخِ کربلا گواہ ہے کہ جب حسینؑ نے عاشور کی شب محضرِ شہادت پیش کر کے ایک ایک کو خبرِ شہادت سُنائی تو اصحاب و اعزا میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مرنے کی خبر سُنی گویا عروسی کا مژدہ سُنایا گیا۔ گلا کٹنے کی اطّلاع کیا ملی گویا کوئی عظیم انعام ہاتھ آگیا ــــ ہاں ایک کمسن بچّہ تھا جس نے اپنا نام نہیں سُنا تو بیچین ہو کر خیمہ کے ایک گوشے میں آیا اور زار و قطار رونا شروع کیا ــــ ہائے میرا مقدّر ــــ سب گلا کٹائیں گے میں رہ جاؤں گا ــــ سب مولا کے کام آئیں گے میں نہ آسکوں گا ــــ سچ ہے کیوں نہ ہو میرا مقدّر ہی ایسا ہے۔ بچپنے میں باپ کے سایہ سے محروم ہوگیا۔ اب ایک منزلِ شہادت رہ گئی تھی اس سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔ روتے روتے دل میں خیال آیا کہ میرے بازو پر ایک تعویذ بندھا ہے ــــ جو میرے بابا نے مشکل کے وقت کے لیے باندھ دیا تھا ــــ دیکھوں شاید میری مشکل کا حل نکل آئے۔ شاید میری خوش قسمتی کا راز اسی دستاویز میں پوشیدہ ہو۔

یہ سوچ کر تعویذ کو کھولا ــــ غور سے پڑھا ــــ کیا دیکھا ــــ باپ نے لکھا ہے ــــ میرے لال قاسم! اگر تیرے چچا پر وقت پڑ جائے

تو اُن کی نصرت ضرور کرنا اور اُن پر قربان ہوجانا ___ قربانی کا پیغام سُنا ___ دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ___ خوشی خوشی چچا کی خدمت میں آئے ___ چچا ! ذرا اس تحریر کو تو پڑھیں ___ امام حسینؑ نے کہا، بیٹا یہ کیا ہے ؟ ___ عرض کی میرے بابا کا نوشتہ ہے ___ اس میں کچھ آپ ہی کے متعلق لکھا ہے۔ حسینؑ نے تعویذ کو لیا ___ بھائی کی تصویر نگاہوں میں پھر گئی ___ کمالِ اشتیاق سے تحریر کو دیکھا اور ایک مرتبہ بیساختہ رونے لگے ___ قاسمؑ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی ___ چچا ! اس میں رونے کی کیا بات ہے ___ ؟ آپ گریہ کیوں فرما رہے ہیں ___ ؟ حسینؑ نے دل سنبھال کر کہا، میرے لال ! یہ تحریر لائے ہو یا اپنی موت کا پیغام لائے ہو ؟

بیٹا ! مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ کل تو یہ بھرا گھر اُجڑنے والا ہے ___ میں نے تیری کمسنی کو دیکھ کر تیری شہادت کی خبر تمہیں سُنائی تھی۔ تیرے نام کے ساتھ موت کا تصوّر میری نگاہوں کے سامنے بھائی کی مٹتی ہوئی تصویر کا خیال لے آتا تھا۔ اے قاسمؑ ! تیرا کیا ذکر ہے ___ کل تو تیرا بھیّا علی اصغرؑ بھی قربان ہوجائے گا ___ اپنی موت کے تصور پہ ہنسنے والا قاسمؑ، علی اصغرؑ کا ذکر سُنتے ہی چونک پڑا ___ چچا ! یہ آپؑ نے کیا فرمایا۔ ___ میرا بھیّا علی اصغرؑ ___ ؟ میرا چھوٹا بھیّا علی اصغرؑ ___ ؟ اصغرؑ کی شہادت کے کیا معنی ___ ؟ کیا اشقیا خیمہ میں داخل ہوجائیں گے ؟ ہاشمی غیرت داد کا سارا بدن کانپنے لگا ___ اشقیاء اور خیمہ ___ ؟ یہاں تو مخدّراتِ عصمت و طہارت ہیں۔ یہاں تو خاندانِ رسالت کی

شہزادیاں ہیں ــ امام حسینؑ قاسمؑ کے جذبات کو سمجھ گئے ــ فرمایا نہیں بیٹا قاسمؑ ــ میں اصغرؑ کو لیکر میدان میں جاؤں گا۔

دل چاہتا ہے عرض کروں۔ حسنؑ کے نورِ نظر قاسمؑ ــ ! ہاشمی غیرت دار قاسمؑ ــ تم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اشقیا خیموں کے اندر آجائیں ــ یہ عاشور کی رات ہے ــ کاش تم عصرِ عاشور ہوتے تو دیکھتے خیموں میں آگ لگی ہوئی ہے ــ چادریں چھن رہی ہیں۔ اور سیدانیاں ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ کی طرف دوڑ رہی ہیں۔

رات گذری۔ عاشور کا لرزتا ہوا سورج طلوع ہوا۔ فوجِ دشمن میں جنگ کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ حسینؑ اپنی مختصر سی سپاہ کو ترتیب دینے لگے ــ تھوڑی دیر گذری تھی کہ تیروں کا مینہہ برسنے لگا۔ اصحاب نے میدان میں قدم جمائے ــ بہت سے چاہنے والے دادِ شجاعت دے کر دنیا سے رخصت ہوئے ــ ظہر کا ہنگام آیا ــ نمازِ ظہر ادا ہوئی ــ اصحاب کے بعد اعزّار کی باری آئی ــ ایک مرتبہ اُمِ فروہ کا لال دستِ ادب جوڑ کر سامنے آیا۔ چچا ! اب اجازت دیجیے۔ ــ آخر میں کب تک ان قربانیوں کو دیکھتا رہوں گا۔ اب دل تنگ ہو رہا ہے اور آپؑ کی بیکسی تڑپا رہی ہے۔ حسینؑ نے قاسمؑ کو سر سے پیر تک دیکھا ــ قاسمؑ کے چہرے پر مرحوم بھائی کی تصویر نظر آئی آنکھوں میں آنسو آگئے ــ دل سنبھال کر فرمایا۔ میرے لال ! کیا واقعاً مرنے پر آمادہ ہو گئے ــ بیٹا کیا اب بھیّا کی تصویر خاک میں مل جائے گی ؟ قاسمؑ

نے اصرار کیا۔ حسینؑ دل سنبھالتے سنبھالتے بھی ہاں نہیں کہہ سکے۔
ایک مرتبہ قاسمؑ نے جھک کر سر قدموں پر رکھ دیا اور پیروں کو چومنا شروع
کر دیا۔ حسینؑ نے تڑپ کے گلے سے لگا لیا ــــ دل نے آواز دی ــــ جاؤ
میرے لال جاؤ ــــ آج تو مجھے سارے داغ اٹھانا ہیں ــــ جاؤ قاسمؑ
جاؤ ــــ چچا تمھاری لاش پر بھی آنسو بہائے گا ــــ جاؤ بیٹا جاؤ ــــ
اب ان آنکھوں سے بھیا کی مٹتی ہوئی تصویر بھی دیکھوں گا۔

اجازت ملی، قاسمؑ چلے۔ سارے مناظر کا ذکر نہیں کروں گا۔ بس
ایک منظر۔ زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرے، چچا کو آواز دی۔ حسینؑ
تیزی سے بڑھے۔ کیا دیکھا۔ قاتل سرہانے تلوار لیے بیٹھا ہے اور گلا کاٹنا
ہی چاہتا ہے۔ خدا کسی چچا کو یہ منظر نہ دکھائے۔ تڑپ کر آواز دی۔ قاسمؑ گھبرانا
نہیں، میں آگیا۔ بیٹا! تیرا چچا تیرے قریب ہے۔ قاتل نے مولا کی یہ آواز
سنی۔ لشکر کو آواز دی۔ دوڑو! میں حسینؑ کے حملہ کی زد پر آگیا۔ لشکر تیزی
سے بڑھا۔ اِدھر حسینؑ۔ اُدھر سے بڑھتا ہوا لشکر اور بیچ میں قاسمؑ کا جسمِ نازنین۔
گھوڑے قاسمؑ کے جسمِ نازنین سے گذر گئے۔ کمسن لال کے سینے کی ہڈیاں
ٹوٹنے لگیں۔ جب گھوڑے کی ٹاپ سینے پر پڑتی تھی تو بیساختہ زبان سے
نکل جاتا تھا۔ چچا۔ چچا۔ چچا۔ حسینؑ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ہائے میرے قاسمؑ
میرے لال۔ میرے جانِ برادر۔ تیرا چچا شرمندہ ہے کہ تیرے کام نہ آسکا اور اس
وقت آیا جب تیرا جسم گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہوگیا۔

"اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ"

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ ۔ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ وَاللَّعْنَۃُ الدَّائِمَۃُ عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ وَقَاتِلِیْھِمْ اَجْمَعِیْنَ مِنَ الْاٰنَ اِلٰی قِیَامِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔"

مالکِ کائنات اپنے حبیبؐ کا تعارف کراتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ "یہ محمدؐ صرف میرا رسول ہے۔" اس میں رسالت کے علاوہ کوئی چیز تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا قرآنِ حکیم کے اس فقرہ کے بارے میں آج مجھے اس نکتہ پر تبصرہ

کرنا ہے کہ مالکِ کائنات نے اپنے حبیبؐ کے رسول ہونے کا اعلان کیا ہے۔ رسول بنانے کا اعلان نہیں کیا۔ قدرت یہ بتانا چاہتی ہے کہ آج میں جس رسالت کا اعلان کر رہا ہوں، وہ آج کی نہیں بلکہ یہ حبیب سے دنیا میں آیا ہے رسول ہی بن کر آیا ہے۔

رسالت کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان یہ ایک عجیب غریب بحث ہے کہ رسول، رسول بن کر دنیا میں آتا ہے یا یہاں آنے کے بعد دنیا کے دوسرے عہدیداروں کی طرح رسول بنایا جاتا ہے ـــــ مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ہے جو مرسلِ اعظمؐ کو ابتدائے حیات سے رسول نہیں مانتا اور اس کا یہی خیال ہے کہ پیغمبر بھی دنیا کے دوسرے عہدیداروں کی طرح ایک مدّت گذرنے کے بعد رسالت کی ذمّہ داریاں سنبھالتا ہے اور مالک کائنات اس کی صلاحیتوں کا تجربہ کرنے کے بعد اسے منصب عطا کرتا ہے۔ ان مسلمانوں کے نزدیک بعثت کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر میں اللہ نے پیغمبر کو رسالت کے عہدہ سے سرفراز فرمایا۔ اس سے پہلے وہ سب کچھ تھے لیکن رسول نہیں تھے ـــــ اسی رسول نہ ہونے کے نظریہ نے دنیا کو کردارِ پیغمبرؐ پر بحث کرنے کا موقع دیدیا اور اب مسلمانوں ہی میں یہ بحث چھڑ گئی کہ رسول نہ ہونے کے دور میں رسول کیسا ہوتا ہے ـــــ اس کی زندگی کیسی ہوتی ہے ـــــ اور اس کے اعمال و کردار کی کیا نوعیّت ہوتی ہے ـــــ ؟

بعض مسلمانوں نے تو صاف لفظوں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ رسالت سے پہلے رسول ہر برائی کا مرتکب ہو سکتا ہے یہاں تک کہ کافر بھی ہو سکتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں ـــــ یہ ہے مسلمانوں کا ذہن ـــــ اور یہ ہے ان کا رسول ـــــ حیرت تو یہ ہے کہ یہ خیالات اس دور میں پیدا کیے جا رہے ہیں جب دنیا کی ہر قوم اپنے لیڈر اور اپنے رہنما کے کردار کو بلند کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔

مجھے اس وقت ان نظریات پر تبصرہ کرنا نہیں ہے ـــــ صرف یہ کہنا ہے کہ اگر یہ نظریہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو مرسلِ اعظمؐ کی حیاتِ طیبہ پر کوئی اثر نہ پڑے گا، اور نہ آپؐ کی زندگی کو نشانۂ اعتراض بنایا جا سکتا ہے ـــــ اعتراض میں صاف لفظوں میں اقرار کر لیا گیا ہے کہ یہ ساری باتیں رسالت سے پہلے جائز ہیں۔ نبوّت و رسالت کے بعد ان برائیوں کا کوئی امکان نہیں ہے۔ نبوّت پانے کے بعد نبی عالم بھی ہوتا ہے، اور معصوم بھی۔ بلند کردار بھی ہوتا ہے اور بلند افکار بھی ـــــ اب مرسلِ اعظمؐ کی زندگی میں اس دور کا جائزہ لینا پڑے گا جب آپؐ رسول نہیں تھے ـــــ اگر ایسا کوئی دَور مل گیا تو آپؐ کا کردار موضوعِ گفتگو بنایا جائے گا اور ایسا کوئی دَور نظر ہی نہ آیا تو نبوّت کے کردار پر کسی بحث کی گنجائش نہیں ہے

آئیے دیکھیں کہ پروردگارِ عالم کا ارشاد کیا ہے اور جس نے رسالت کا منصب دیا ہے اس نے کب اور کن حالات میں دیا ہے ـــــ قرآن مجید کا اعلان ہے۔ " هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ

"وہ خدا وہ ہے جس نے مکّہ والوں کے درمیان ایک رسول بھیجا ہے جو انھیں میں سے ہے۔"

اربابِ نظر غور کریں۔ مالکِ کائنات نے مکّہ والوں میں رسول بھیجا ہے، بنایا نہیں ــــ بھیجنے اور بنانے کا فرق محسوس کرنا ہے تو ایک مرتبہ دنیا کے عہدوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ دنیا کے عہدوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عہدہ وہ ہوتا ہے جس میں بھیجنے کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ جو صاحبِ صلاحیّت جہاں ہوتا ہے اسے وہیں عہدہ دار بنا دیا جاتا ہے۔ جیسے سفارت کا عہدہ کہ کسی ملک میں سفارت کا عہدہ اس ملک کے باشندے کو نہیں دیا جاتا ہے بلکہ ہر ایک اپنے ملک کے آدمی کو سفیر بنا کر دوسرے ملک میں بھیجا کرتا ہے۔ ایسے عہدوں میں یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ حکومتیں کسی آدمی کو دوسرے ملک میں عام باشندوں کی طرح بھیج کر ایک عرصہ کے بعد اپنا سفیر بنا دیا کرتی ہیں یا سفارت کی ساری ذمّہ داریاں دے کر بھیجا کرتی ہیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ سفیر دوسرے ملک میں نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ اپنے ملک میں بنا کر دوسرے ملک میں بھیجا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بھیجنے میں دو معانی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ جسے بھیجا گیا ہے اسے پہلے عہدہ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بھیجا گیا ہے اور دوسری بات یہ کہ جہاں بھیجا گیا ہے عہدہ وہاں کا نہیں ہے بلکہ اپنے ہمراہ کہیں سے لیکر آیا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دنیا کی عام حکومتیں اپنا نمائندہ بھیجیں تو کسی انسان کو یہ کہنے کا حق نہیں پیدا ہوتا کہ ابھی تو آپ آئے ہیں دس بیس سال

کام کیجیے، اس کے بعد ہم آپ کی سفارت پر غور کریں گے بلکہ جس دن سفیر اپنے ملک سے نکلتا ہے اسی دن اسے سفیر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ چاہے دوسرے ملک میں پہونچنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جائے اور جب مذہب کی بات آتی ہے تو خدائی نمائندہ کے بارے میں یہ بحثیں اٹھائی جاتی ہیں کہ وہ کب سے نبی ہے، اور کب سے رسالت کے منصب پر فائز ہوا ہے۔

قرآن حکیم نے بعثت کا لفظ منتخب کر کے مسلمانوں کے ذہنوں کو بیدار کر دیا کہ ہم نے مکّہ میں رسول بھیجا ہے، رسول بنایا نہیں بلکہ رسول بنا کر مکّہ میں بھیجا ہے۔ اب اندازہ کرو کہ یہ بشر نہیں ہے رسول ہے اور اس کی رسالت تمہارے گھر کی نہیں ہے بلکہ ہمارے گھر کی ہے۔

یاد رکھیے ــــ! نمائندگی والے عہدے عام ملکی عہدوں سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہوتے ہیں۔ ملک کے اندر کے عہدوں میں عہدہ دار بظاہر حکومت کے زیرِ نگرانی کام کرتا ہے۔ اسے ہر وقت حکومت کی کڑی نگرانی کا سامنا رہتا ہے ــــ احکام حکومت کے ہوتے ہیں اور عملدرآمد حکام کا ــــ اور نمائندگی کے عہدوں کا اندازہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہاں سفیر کے افکار و کردار پر اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہر عمل میں حکومت کی رائے کا منتظر نہیں رہتا، بلکہ حکومت کی پوری پالیسی کو سمجھ کر دوسرے ملکوں میں جاتا ہے، اور اسی پالیسی کے تحت معاملات طے کرتا رہتا ہے۔ اور حکومت اسے سفیر کی رائے نہیں قرار دیتی

بلکہ اپنی رائے قرار دیتی ہے۔

توجب عام انسان اپنے عہدوں میں اتنی احتیاط برتتے ہیں تو مالکِ کائنات کی احتیاط کا کیا عالم ہوگا۔ اور وہ سفیر بنائے گا تو اس کا کردار کتنا بلند ہوگا ـــــ ؟ یہی وجہ ہے کہ مالکِ کائنات نے جسے بھی سفارت کا عہدہ دیا اسے اپنی پوری تنظیم سے باخبر کرکے دنیا میں بھیجا، تاکہ یہ مشیّت کی روشنی میں اپنے اعمال کو انجام دیتا رہے اور میں یہ اعلان کرتا رہوں کہ یہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، یہ جو کچھ کہہ رہا ہے سب میری وحی کے مطابق ہے۔ ـــ اس نے سنگریزے خود نہیں پھینکے ہیں، میں نے پھینکے ہیں ـــــ اس کا ارادہ اپنا ارادہ نہیں ہے، میرا ارادہ ہے۔

مسلمانو! ـــ کیا کوئی عام خاطی اور گنہگار انسان زندگی کے کسی موڑ پر یہ منزل حاصل کرسکتا ہے کہ اس کا قول و فعل اس کی رفتار و گفتار سب مالک کائنات کی طرف منسوب ہو جائے۔

مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہی مسلمان جب قرآن مجید میں یہ آیت پڑھتا ہے:

"وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ"

(اے رسول! ہم نے آپؐ کو رحمت (عالمین کیلئے) بنا کر بھیجا ہے)

تو کہتا ہے کہ حضور یہاں آکر رحمت نہیں بنے بلکہ جب آئے تھے تو رحمت تھے اور جب عرشِ اعظم پہ جلوہ فرما تھے جب بھی رحمت ہی تھے اور جب یہ

آیت سامنے آتی ہے:

"بَعَثَ فِی الْاُمِّیِّیْنَ رَسُوْلاً"

(اس نے مکّہ والوں میں رسول بھیجا ہے)

تو یہ بحثیں شروع ہو جاتی ہیں کہ دنیا میں آنے کے بعد کب سے رسول ہوگئے یہ ایمان کی کمزوری اور عمل سے فرار کی صورت ہے جہاں مسلمان کلمہ پڑھنے کے بعد بھی نبی کی زندگی پر بھروسہ کرنا نہیں چاہتا اور اسی نافہمی کا نتیجہ تھا کہ عمر نبوت بڑھتی رہی اور مسلمان منصب کا فیصلہ نہ کر سکے یہاں تک کہ حدیبیہ کی منزل آگئی اور فیصلہ نہ ہو سکا ـــــ بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ نبی کی زندگی کا آخری وقت آگیا اور مسلمان فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ رسول ہیں یا نہیں۔

اگر ایمان اسی کا نام ہے تو نفاق کیا ہے۔ اگر اسلام اسی کو کہتے ہیں تو کُفر کے معنی کیا ہوں گے ـــ؟ یہی ایک سلسلۂ نافہمی ہے جو صدرِ اسلام سے چلا آرہا ہے اور آج تک باقی ہے۔ اور آج بھی یہ بحثیں جاری ہیں کہ نبی کب سے نبی ہوتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مسلمان نبوّت و رسالت کے مسائل خود کیوں حل کرنا چاہتے ہیں۔ اور نبی ہی سے دریافت کیوں نہیں کرتے کہ آپؐ کی نبوّت کی منزل کیا ہے۔؟ آئیے چلیے، حضورؐ سے پوچھیں کہ حضورؐ کی نبوّت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا ہے ـــ سرکار کو رسالت کا عہدہ کب ملا؟ آواز آتی ہے۔ "کُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ"۔

(حدیث)

(میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ آب و گِل کے درمیان تھے)

اب پہچانا آپ نے اس وفادار اُمت کو ــ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں آدمؑ سے پہلے نبی تھا اور یہ سوچ رہے ہیں کہ دنیا میں آنے کے بعد بھی نبی تھے یا نہیں ــ افسوس اس امت نے عرفان نبی میں کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں اور نبوّت کی زندگی کو کتنا بے وزن بنادیا ہے۔

حیرت تو یہ ہوتی ہے کہ یہ مسلمان ہمارے اوپر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ قوم نبوّت کی معرفت نہیں رکھتی۔ اسے پیغمبرِ اسلام کی عظمتوں کا علم نہیں ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ اگر عرفانِ نبوّت یہی ہے تو ہم بے معرفت ہی اچھے ہیں، اور اگر اسلام اسی توہینِ پیغمبرؐ کا نام ہے تو اس اسلام سے مشرکین کا کفر ہی اچھا تھا جو کم از کم صادق و امین تو سمجھتے تھے یہاں تو چالیس سال سے پہلے ہر بُرائی کا جواز ڈھونڈا جارہا ہے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے مرسلِ اعظمؐ کو اشرف المرسلین اور خاتم النبیین قرار دیا ہے۔ اور قرآنِ حکیم میں جو انبیاءِ سابقین کی تاریخ ملتی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیگر انبیاء کا مرتبہ رسولِ اسلام سے بلند تھا۔ آئیے ذرا ایک نظر اللہ کے عہدہ داروں کی تاریخ پر ڈالیں۔ سب سے پہلے جناب آدمؑ کا نام آتا ہے جن کے منصب کا اعلان ان کی خلقت سے پہلے ہی ہوگیا اور مالکِ کائنات نے پیکرِ آدمؑ کی تخلیق سے پہلے اعلان کر دیا کہ:

"میں روئے زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" ــــ

یعنی اے ملائکہ ہوشیار ہو جاؤ ــــ" اور اے قرآن کو پڑھنے والو ہوش میں آجاؤ" کہ جو بنایا جا رہا ہے وہ عام انسان نہیں ہے بلکہ خلیفۃ اللہ ہے۔ اب پہچانا آپ نے ـــ آدمؑ کی خلافت اور ان کے منصب کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا ہے؟

جناب آدمؑ کے بعد جناب ابراہیمؑ کے حالات دیکھیے۔ جہاں کمال عقل و شعور اور احساسِ ذمہ داری کا یہ عالم ہے کہ زندگی کی ابتدائی منزلوں سے گذر رہے ہیں اور کائنات کی بے ثباتی، دنیا کی ناپائیداری کا حوالہ دیتے ہوئے رب العالمین کی حکمت و برتری کا اعلان کر رہے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ، فرعون کی آغوش میں ہیں اور نبوّت کے ان کمالات کا مظاہرہ کر رہے ہیں جنھیں دیکھ کر فرعون جیسا مغرور و متکبر انسان بھی یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ بچّہ عام بچّوں جیسا بچہ نہیں ہے اس کا تو انداز ہی نرالا ہے۔ اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ وہی ہے جس کے بارے میں مجھے خبر دی گئی ہے کہ میری مملکت میں بچّہ پیدا ہوگا جو آگے چل کر میری حکومت کا تختہ اُلٹ دے گا۔

حضرت عیسیٰؑ ماں کی گودی میں ہیں اور آواز دے رہے ہیں:

"اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا" اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔"

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ منصبِ نبوّت سن و سال اور عمر کا محتاج نہیں ہے، میں آغوشِ مادر میں ہوں لیکن مجھے نبوّت مل چکی ہے۔

مسلمانو ! ذرا انصاف سے بتاؤ تمھارا رسول کیونکر افضل المرسلین ہو گا۔ مرسلین کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ قبلِ خلقت حاملِ منصب تھے۔ انبیاء کا کردار گواہ ہے کہ وہ بچپنے ہی سے اپنی نبوّت کا اعلان و اظہار کیا کرتے تھے اور ایک تمھارا نبی ہے جو چالیس سال کی عمر تک نبوّت سے محروم رہا۔ کیا ایسے نبی کو بھی افضل الانبیاء کہا جا سکتا ہے۔

یاد رکھو ! اگر حضورؐ کی افضلیت کا تحفّظ کرنا ہے، اگر اسلامی غیرت کو زندہ رکھنا ہے ــــ تو ماننا پڑے گا کہ اگر سارے انبیاء قبلِ خلقت نبی تھے۔ اگر آدمؑ پیکرِ خاکی کے قبل خلیفۃ اللہ تھے تو میرا نبی اُس وقت بھی نبی تھا جب کائنات عدم کے سنّاٹے میں سو رہی تھی۔ جب آدمؑ آب و گِل کی منزل سے گذر رہے تھے ــــ جب کون و مکان میں کچھ نہیں تھا لیکن خدا کی خدائی تھی اور محمدؐ کی جلوہ نمائی۔

ایسا ہی ایک ماحول تھا جب مالک نے جبریل کو پیدا کر کے ان سے پوچھا تھا کہ اے جبریل ! بتاؤ تم کون ہو اور میں کون ہوں ؟ اور جبریل حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہے تھے کہ پردۂ غیب سے ایک آواز آئی تھی جبریل کہہ دو۔ "تو ربِّ جلیل ہے اور میں عبدِ ذلیل۔ تیرا نام جلیل ہے اور میرا نام جبریل ہے۔

مَلَک نے جواب دیا۔ ملکوتیت کی عزّت بچی۔ عصمت کا وقار بڑھا ــــ اور مجھے کہنا پڑا کہ جہاں خدا کی خدائی تھی وہیں محمدؐ کی جلوہ نمائی ــــ اور جس ماحول میں محمدؐ کی جلوہ نمائی تھی اسی ماحول میں علیؑ کی

مشکل کشائی۔

منصبِ الٰہی کی اسی برتری کے ظاہر کرنے اور سن وسال کے اسی امتیاز کو مٹانے کے لیے مرسلِ اعظمؐ مباہلہ کے میدان میں سب سے آگے حسینؑ کو لے گئے تھے گویا نبیؐ یہ اعلان کر رہے تھے کہ دیکھو جو عمر میں سب سے کم ہے وہ حق کے معاملہ میں سب سے آگے آ گیا ہے۔ ابھی تم نے حق کی عظمتوں کو نہیں پہچانا ہے۔ ابھی تمھیں اہلِ منصب کی بلندیوں کا علم نہیں ہے۔

اربابِ عزا ـــــ! رسولؐ نے مباہلہ کے میدان میں منصب دار کے بچپنے کی عظمت کا اظہار کیا اور حسینؑ نے کربلا میں شیر خوار کی عظمت کا اعلان کیا۔ حسینؑ نے آواز دی "دنیائے اسلام ابھی تو منصب دار کی عظمت سے نا آشنا ہے تو دیکھ میرے گھر کا شیر خوار کتنا بلند کردار اور باشعور ہوتا ہے۔

صدائے استغاثہ کے بعد جب علی اصغرؑ نے اپنے کو جھولے سے گرادیا اور خیمہ میں کہرام برپا ہوا تو سرکار سیّد الشہداء درِ خیمہ پر آئے ـــــ فرمایا، بہن زینبؑ! یہ کہرام کیسا ہے ـــــ؟ عرض کی بھیّا! آپ کی آوازِ استغاثہ سُن کر علی اصغرؑ نے اپنے کو جھولے سے گرادیا ہے۔ ـــــ حسینؑ نے سر جھکالیا۔ میں سمجھ گیا بہن، میرا اصغرؑ کیا چاہتا ہے۔ ـــــ اچھا لاؤ اب اسے میرے حوالے کردو ـــــ بہن نے عرض کی بھیّا! وہ کسی کی گود میں نہیں آرہا ہے۔

حسینؑ خیمہ میں داخل ہوئے۔ اصغرؑ کے قریب آئے۔ باپ نے کیا کہا، کون سمجھے ــــ؟ اور بیٹے نے کیا سمجھا، کون جانے ــــ؟ ہاں اتنا سب نے دیکھا کہ باپ نے ہاتھ پھیلائے اور بچہ ہمک کر باپ کی گودی میں آ گیا ــــ عجب نہیں مقصد یہ رہا ہو، اصغر! چلو۔ میرے لال ــــ اب تمھاری بھی قربانی کا وقت آ گیا ــــ چلو بیٹا! اپنے ہاتھوں سے یہ آخری قربانی بھی بارگاہِ احدیت میں پیش کر دوں۔

گودی میں لیا ــــ چلے ــــ درِ خیمہ کے قریب پہونچے ــــ دیکھا، ماں سر جھکائے کھڑی ہے ــــ اشارہ کو پہچانا ــــ فرمایا، رباب! خیر تو ہے۔ یہاں کیوں کھڑی ہو ــــ؟ کہا، وارث کیا کروں ــــ دل نہیں مانتا ہے، آپ میرے لال کو وہاں لیے جا رہے ہیں جہاں صبح سے جو بھی گیا ہے، واپس نہیں آیا ــــ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکیں ــــ وہ ماں کیا کرے جسے ایک طرف شرم کھائے جا رہی ہے اور دوسری طرف بچہ کی محبت دل کو بڑھائے دے رہی ہے۔ نظروں سے اپنے لال کی بلائیں لیں دل نے دھیرے سے آواز دی ــــ جاؤ ــــ اصغر جاؤ ــــ میں سمجھ گئی اب یہ جھولا پھر نہ آباد ہو گا ــــ میرے لال! ایک دفعہ اپنی چاند سی شکل پھر دکھا دینا ــــ بیٹا! محبت بیچین کیے دے رہی ہے ــــ لیکن کیا کروں، میرے لال ــــ دین کا معاملہ ہے ــــ مولا کی زندگی کا سوال ہے۔ کاش تیری قربانی سے تیرے بابا کی جان بچ جاتی ــــ دل میں ایسے ہزاروں خیالات ابھر رہے تھے۔

جذبات کا ایک سیلاب تھا جو اُمڈا چلا آ رہا تھا ۔ آنکھوں سے آنسو کا ایک دریا تھا جو بہتا چلا جا رہا تھا ۔ حسینؑ بھی آخر باپ تھے ماں کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئے ۔ مشیّت کی پابندیاں ۔ سر جھکا کر فرمایا، لیکن رباب تمھارا بچّہ تو کمسن ہے، شاید کسی کو اس کے حال پر رحم آجائے ۔ دھڑکتا ہوا دل ٹھہرا ۔ ہاں لشکرِ یزید میں کوئی تو صاحبِ اولاد ہوگا ۔ کسی کے پہلو میں تو دل ہوگا ۔ کوئی تو میرے بچّے کے نیلے ہونٹوں کو دیکھے گا ۔ یہ خیالات ذہن میں گونج ہی رہے تھے کہ ایک مرتبہ پھر خیال کا رُخ بدلا ۔ ارے جسے شہزادی لیلیٰ کے لال پر رحم نہ آیا اُسے میرے اصغرؑ پر کیا رحم آئے گا۔ جس نے عونؑ و محمدؑ کی تصویر خاک میں ملا دی وہ میرے لال پر کیا رحم کرے گا۔ جس نے اُمِ فروہ کے چاند کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کر دیا وہ چھ مہینے کی جان کا کیا خیال کرے گا ۔ دل تڑپا۔ جذبات کا طوفان اُمڈا، لیکن اللہ رے حوصلہ ۔ خیمہ میں آکر بیٹھ گئیں ۔ کچھ سہی، اب تو میں نے اپنے لال کو رخصت کر دیا ہے۔ مولا سے بہتر محبّت کرنے والا کون ہے۔ جب وہ قربان کرنے پر آمادہ ہیں تو میں کون سوچنے والی۔

کاش ! تاریخ کے پاس لفظیں ہوتیں ۔ کاش مورخ کے پہلو میں مامتا بھرا دل ہوتا تو بتاتا کہ رباب کے دل پر کیا گذر رہی ہے ۔ لیکن افسوس ۔ مقاتل خاموش ہیں ۔ جذبات کی دنیا کچھ اشارے دے رہی ہے۔ فضا میں سنّاٹا چھایا ہوا ہے۔ حسینؑ، اصغرؑ کے لیے پانی

مانگ رہے ہیں ۔۔۔ اور ایک آواز گونج رہی ہے: اِقْطَعْ کَلَامَ الْحُسَیْنَ حرملہ! حسینؑ کے کلام کو قطع کر دے۔ حُرملہ بڑھا۔ دوش سے کمان ترکش سے تیر نکالا ۔۔۔ تیر چلّہ میں جوڑا ۔۔۔ حسینؑ یہ سارا منظر دیکھ رہے ہیں ۔۔۔ ایک مرتبہ کمان کھینچی۔ گویا حسینؑ کے سینے سے دل کھنچ گیا ۔۔۔ لیکن اللہ رے حوصلہ، ہاتھ کانپے نہیں ۔۔۔ تیر چلا ۔۔۔ اصغرؑ کے گلے پر لگا۔ حسینؑ کا بازو چھدا ۔۔۔ باپ کا دل ٹوٹا ۔۔۔ ماں کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا ۔۔۔ بچّہ باپ کے ہاتھوں پر منقلب ہو گیا۔

حسینؑ نے خونِ اصغرؑ اپنے چہرے پر مَلا ۔۔۔ بیٹا! گواہ رہنا قیامت کے دن یوں ہی رسول اللہؐ سے ملاقات کروں گا۔ نانا! یہ تحفہ آپؐ کی اُمّت نے دیا ہے ۔۔۔ تھوڑی دیر ٹھہرے ۔۔۔ رباب کی یاد آئی ۔۔۔ اصغرؑ کو لے کر چلے ۔۔۔ ماں کو بچّہ کا آخری دیدار کرا دیا جائے درِ خیمہ تک آئے ۔۔۔ دل تڑپا، واپس ہو گئے ۔۔۔ پھر آئے ۔۔۔ رباب کی بیکسی نے پلٹا دیا۔ سات مرتبہ آگے بڑھے اور پیچھے ہٹ گئے ۔۔۔ ہائے ماں بچّہ کی اس حالت کو کیسے دیکھے گی ۔۔۔؟ آخر میں دل کو سنبھالا ۔۔۔ یہ سوچ کر بڑھے کہ اب تو اصغرؑ رخصت ہو چکے ہیں۔ ماں کو آخری دیدار سے کیوں محروم کیا جائے ۔۔۔ درِ خیمہ پر آئے ۔۔۔ آواز دی ۔۔۔ رباب ۔۔۔! اپنے بچّہ کو لے جاؤ ۔۔۔ خیمہ میں آواز پہونچی ۔۔۔ رباب دوڑی ۔۔۔ لیکن قدم نہ اُٹھے ۔۔۔ مامتا نے قدم تھام لیے ۔۔۔ رباب کہاں جا رہی ہو ۔۔۔؟ کیا سمجھتی ہو اصغرؑ پانی

پی کر آئے ہیں ــــ ؟ کیا تمھارا بچّہ زندہ وسلامت آیا ہے ــــ ؟ کیا پھر اپنے لال کی چاند سی شکل دیکھنے جا رہی ہو ــــ ؟ قدم رُکے ــــ شوق نے پھر سہارا دیا ــــ گرتے پڑتے درِ خیمہ تک پہونچیں۔

مامتا نے گھبرا کے گودی پھیلا دی ــــ حسینؑ سے سر اُٹھا کر دھیرے سے عبا کا دامن سَرکایا ــــ ماں نے خون کی چھینٹیں دیکھیں۔ دل دھڑکا ــــ جھک کے غور سے دیکھا ــــ ارے یہ تو گلے پر تیر کا نشان ہے ــــ یہ کُرتا تو خون میں تر ہے ــــ بچّہ تو مر چکا ہے ــــ کیوں آقا ــــ ؟ آپؑ اصغؑر کو ماں سے ملانے کے لیے لائے ہیں ؟ میرے وارث ــــ ! اصغؑر کو پانی مل گیا ؟ والی ! دشمن کو میرے لال پر رحم آگیا ــــ ؟ یہ کہتے کہتے ایک مرتبہ اصغؑر کی طرف مڑیں۔ مامتا نے فریاد کی ــــ رباب ! تو نے تیروں کی بوچھار میں بھیجا ہی کیوں تھا۔ خیال آیا میرا اصغؑر کیا کہے گا۔ گھبرا کر پکار اُٹھیں، بیٹا ! مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس سن کے بچے بھی نحر کر دیے جاتے ہیں۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

۹

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَآءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ۔ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ وَ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى اَعْدَآئِهِمْ وَقَاتِلِيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ

اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ الْحَكِيْمُ فِيْ كِتَابِهِ الْكَرِيْمِ

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ"

مالکِ کائنات کا ارشاد ہے۔ "محمدؐ صرف "اللہ کے" رسول ہیں"
ان کی حیات ــــ ان کی موت ــــ ان کا عمل ــــ ان کا کردار، ان کی عبادتیں
ان کی ریاضتیں، سب اللہ کے لیے ہیں۔ ان کی زندگی میں رسالت کے
علاوہ کوئی پہلو نہیں ہے۔ ان کے کردار میں کارِ رسالت کے علاوہ کوئی
گوشہ نہیں ہے۔ ایسی جامع رسالت اور ایسی ہمہ گیر نبوّت جس کا تصور بھی
مشکل ہے اور جب ایک عام انسان ایسی رسالت کا تصوّر کرنے سے

قاصر ہے تو وہ رسول کا مرتبہ کیا سمجھے گا۔ رسول کو سمجھنے کے لیے رسالت کا سمجھنا ضروری ہے اور رسالت کے سمجھنے کے لیے جن شرائط کی ضرورت ہے ان کا کسی انسان میں فراہم ہونا مشکل نہیں بالکل ناممکن ہے۔

یہ ایک احسان تھا سرکارِ رسالت کا، کہ انھوں نے عرفانِ الٰہی کے ذیل میں اپنی معرفت کا بھی طریقہ بتا دیا اور یہ دشواری جو آج ہمیں معرفتِ رسولؐ کے بارے میں پیش آرہی ہے یہ اس سے پہلے عرفانِ الٰہی کے بارے میں پیش آئی جس کا احساس خود سرکارِ دو عالمؐ نے کیا اور ایک فقرے میں عرفان کے سارے راستے کھول دیے۔ عبدیّت کو سہارا مل گیا۔ بندگی تیز تیز قدم بڑھانے لگی۔ عاجزی کے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خشک ہو گیا اور سکونِ قلب نے آواز دی اس سے بہتر کوئی ذریعہ ہو سکتا تھا۔ رسولِ اعظمؐ نے بارگاہِ احدیّت میں دست بستہ آواز دی —:

"مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ"

مالک"! جو تیری معرفت کا حق تھا، وہ ادا نہ ہو سکا۔"

تجھے ویسے نہ پہچانا جو حقِ معرفت تھا۔ الوہیّت، عبدیّت کے ذہن میں کیونکر سماتی — مالک غلام کے تصوّرات کا کیونکر پابند بنتا۔ ربّ العالمین ذہنوں کی تراش خراش میں کیونکر آتا — یہ تیرا احسان تھا کہ تو نے اتنی ہی عاجزی کو قبول کر لیا اور یہ تیرا کرم تھا کہ تو نے ہماری طاقت سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا۔

مالک! تجھے اتنا ہی پہچانا ہے کہ تو ہمارے ذہنوں میں آنے والا

نہیں ہے۔ تو ہمارے دل و دماغ کا پابند نہیں ہے۔ اس سے زیادہ بندگی کے امکان میں کچھ نہیں ہے۔

مرسلِ اعظمؐ کا یہ اندازہ دیکھ کر دھڑکتا ہوا دل ٹھہر گیا۔ عقیدۂ رسالت دل و دماغ میں اُتر گیا۔ قلب و نظر کو سکون کی منزل مل گئی۔ سارا اضطراب یہ تھا کہ بغیر پہچانے ہوئے مانیں کیسے؟ اور بغیر سمجھے ہوئے ایمان لائیں کیسے ——؟ پھر اگر سمجھنا بھی چاہیں تو چھوٹے سے آئینہ میں اتنی بڑی تصویر بنائیں کیسے۔؟ ناچیز دل میں مختارِ کل کا جلوہ نظر آئے کیسے ——؟ ایک مرتبہ دل نے آواز دی —— خبردار گھبرانا نہیں —— رسالت کو پہچاننا ہے تو رسول ہی سے درسِ معرفت حاصل کرو اور ان کی بارگاہ میں وہی طریقۂ عجز و نیاز اختیار کرو جو اُنھوں نے مالک کی بارگاہ میں اختیار کیا ہے۔ کل انھوں نے ربّ العالمین کی بارگاہ میں عرض کیا تھا۔ مالک! جو حقِ معرفت تھا ویسے نہ پہچان سکا۔ آج تم ان کی بارگاہ میں عرض کرو۔ سرکار! اپنا کلِ عرفان یہی ہے کہ ہم آپؐ کے عرفان سے عاجز ہیں —— اور وہ حقِ معرفت نہیں ادا کر سکے جو غلامی کا فرض تھا۔ لیکن میرے سرکار دل مطمئن ہے کہ اتنا تو سمجھ لیا کہ آپؐ ہماری فکر و نظر سے بالاتر ہیں —— آپؐ کی منزل عرشِ اعظم ہے، ذہنِ بشر نہیں۔ ہمارے ذہنوں میں ایک جھلک بھی آجائے تو ہماری نجات کے لیے کافی ہے۔ ہم وہ انسان نہیں ہیں کہ کچھ نہ پہچانے کے بعد بھی اپنے کو عارفِ کامل ہی سمجھتے رہے اور زندگی بھر رسالت کا

یقین نہ کرنے کے باوجود اپنے کو مسلمِ اوّل ہی تصوّر کرتے رہے۔

خدا گواہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں شک نے راہ نہیں پائی۔ ہمارے دل و دماغ میں یقین کے علاوہ کسی نے جگہ نہیں لی۔ ہماری زندگی آپ کی محبّت کے سوا کچھ نہیں ہے ـــــ ہم نے محبّت کا وہ راستہ اختیار کیا ہے جہاں محبوب کی ہر محبوب شے محبوب ہوتی ہے اور اس کی کراہت باعثِ نفرت بن جاتی ہے۔ اسی لیے ہم نے آپؐ کے اہلبیتؑ سے زندگی کے ہر موڑ پر محبّت کی اور آپ سے الگ ہو جانے والوں کو کبھی محبّت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔

عزیزانِ محترم ! یاد رکھیے کسی چیز کی معرفت کے چند وسائل ہوا کرتے ہیں، یا تو انسان نے اسے خود بنایا ہو کہ اس کے ایک ایک جزو اور ایک ایک گوشے سے باخبر ہو، یا کم از کم اس کی نگاہوں کے سامنے بنا ہو کہ تمام پہلوؤں کو دیکھ بھال لیا ہو۔؟ اور اگر یہ کچھ نہیں ہے تو کم از کم خود بھی اسی درجہ پر فائز ہو کہ یہ جانتا ہو کہ یہ درجہ کیا ہے۔ اور اس منزل پر فائز ہونے والا کیسا ہوتا ہے۔

سرکارِ دو عالمؐ کی ہستی کا عرفان اِس لیے بھی مشکل ہے کہ انھیں ہم نے رسول بنایا نہیں اور نہ بنانے والے نے ہماری نگاہوں کے سامنے رسالت دی ہے اور اس سے بالاتر یہ ہے کہ ہم خود صاحبِ رسالت بھی نہیں ہیں کہ یہ پہچان سکیں کہ رسالت کیا ہے اور رسول کیسا ہوتا ہے۔

ایک بچّہ ہمارے سامنے آکر یہ خبر دیتا ہے کہ ہم نے بی۔ اے پاس

کرلیا۔ تو ہم خوش ہوجاتے ہیں۔ انعام دیتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں یہ خبر بھی نہیں ہے کہ بی۔ اے کیا ہوتا ہے اور بی۔ اے کا درجہ کتنا بلند ہے۔

ہم کسی بڑے عالم و خطیب و مقرّر کی مجلس میں بیٹھے ہیں اور جب کوئی بات پسند آتی ہے تو سبحان اللہ بھی کہتے ہیں لیکن کیا اس سبحان اللہ کا مقصد یہ ہے کہ ہم نکتہ کی ان تمام گہرائیوں تک پہونچ گئے جہاں تک ایک عالم کا ذہن پہونچا ہے ــــ ہرگز نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بیساختہ تعریف کرتے ہیں اور وجد میں جھومنے لگتے ہیں۔

یہ سب عرفان کے وہی فطری طریقے ہیں جن کی طرف سرکارِ دوعالمؐ نے اشارہ کیا تھا کہ تعریف اس بات کی نہیں ہے کہ آپ نے بی۔ اے پاس کرلیا۔ تعریف اس بات کی ہے کہ آپ نے وہ درجہ پالیا جو ہمیں نہیں ملا۔ تعریف اس کی نہیں ہے کہ ہم نے نکتہ سمجھ لیا۔ تعریف اس کی ہے کہ آپ نے وہ کچھ بیان کیا جس کی گہرائیوں تک ہمارا ذہن نہیں پہونچا، ورنہ اگر پوری بات پہلے سے ذہن میں ہوتی تو ہم کبھی سبحان اللہ نہ کہتے۔ کبھی تحسین و آفرین کی آوازیں بلند نہ کرتے۔

پہچانا آپ نے ــــ معرفت کی منزل کتنی سخت ہوتی ہے اور عرفان کے لیے کیا اہم شرائط درکار ہوتے ہیں ــــ جب ہم اپنی محفل کے ایک درجہ کا اندازہ نہیں کرسکتے ــــ اپنی ہی بزم کے ایک نکتہ کا ادراک نہیں کرسکتے تو ہمیں رسالت کا عرفان کیونکر ہوگا ــــ ؟ ہم رسول

تو نہیں ہیں ـــــ ہمارے سامنے رسالت تو تقسیم نہیں ہوئی۔ رسول کو پہچاننا ہے تو اس کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اس خدا سے دریافت کرو جس نے رسول بنایا ہے۔ اس شریکِ نور سے پوچھو جس کی نگاہوں کے سامنے رسالت ملی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مکمل تعارف نہیں کرا سکتا۔ اسی لیے سرکارِ دو عالم ؐ نے فرمایا تھا کہ :

"خدا کو میرے اور علیؑ کے علاوہ کسی نے نہیں پہچانا اور مجھے علیؑ اور خدا کے علاوہ کسی نے نہیں پہچانا۔"

عرفان کی یہ وہ بلند منزل ہے جہاں ذہنوں کا گذر نہیں ـــــ دماغ پہونچ نہیں سکتے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ جس نبی کا وصی یہ اعلان کرتا ہے کہ میری بلندی تک کسی کے طائرِ فکر کی رسائی نہیں ہے۔ اُس نبی کی منزل تک کون پہونچے گا۔ جس کی جوتیاں ساتوں آسمانوں کو روند آئی ہوں اس کی منزلِ کمال کا اندازہ کون کرے گا ـــــ جس کی عظمتوں کے سامنے کائنات کا سر خم ہو اس کی بلندی کا اندازہ کون کریگا۔

دنیا مبالغہ اور غلو نہ سمجھے تو میں یہاں تک عرض کر دوں کہ جلالتِ مرسل کی منزل میں ہم ہی نہیں انبیاء و مرسلین بھی عاجز نظر آتے ہیں۔ انسانی دنیا میں عاجز آنے کے بعد میں نے انبیاء و مرسلین کی محفل میں قدم رکھا۔ ان سے پوچھوں میرے رسول کی منزل کیا ہے اور حبیبِ الٰہی کی جلالتِ قدر کیا ہے ؟

حضرت عیسیٰؑ سے پوچھا۔ آپ کا زمانہ قریب تر ہے آپ فرمائیں

اس رسول کا درجہ کیا ہے ؟ عیسیٰؑ نے آواز دی۔میری حیثیت تو صرف ایک بشارت دینے والے کی ہے، میں کیا بتاؤں کہ اس کا مرتبہ کیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ سے پوچھا، آپ فرمائیں، اس رسول کی عظمتیں کیا ہیں؟ آواز آئی میری منزل کوہ طور ہے اور اس کا درجہ منزلِ نور —— میں کیا بتاؤں کہ اس کا مرتبہ کیا ہے۔

آگے بڑھ کر حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا۔خلیلِ خدا! آپ بتائیں آپ کے اس پوتے کا مرتبہ کیا ہے —— ؟ خلیل نے آواز دی۔میں کیا بتاؤں یہ میری خلقت سے ہزاروں سال پہلے پیدا ہوا ہے میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اس کا نور میرے صلب میں نہ ہوتا تو نارِ نمرود سے نجات نہ ملتی۔

حضرت نوحؑ سے پوچھا۔انھوں نے فرمایا۔یہی تو وہ ہے جس کی وجہ سے کشتی کو قرار ملا۔

حضرت آدمؑ سے سوال کیا۔ اے نبیٔ خدا ! آپ تو ابو البشر ہیں آپ فرمائیے، آپ کے فرزند کی منزلِ رسالت کیا ہے —— ؟ آواز آئی میں ابو البشر ہوں سید الانبیاء نہیں ہوں۔میں تو اُس وقت آب و گل کے درمیان تھا جب یہ منزلِ نبوّت پر فائز ہو چکا تھا میں کیا بتاؤں کہ اس کی منزلِ نبوّت کیا ہے —— ؟

جب انبیاء و مرسلین کی محفل سے بھی محروم ہو گیا اور کوئی جواب نہ ملا۔تو آیا مشکل کُشا کے دروازے پر —— اے مشکلکشائے دوجہاں —— ! آپ نے سب کی مشکل حل کی ہے میں بھی ایک عقدہ لیکر

آیا ہوں، اسے حل کر دیجیئے ــــ فرمایا، وہ کیا ـــ ؟ میں نے دستِ ادب جوڑے اور عرض کی، آپ فرمائیں، اس آخری نبی کا مرتبہ کیا ہے ؟ ـــ آواز آئی، بس یہ پہچانو کہ میں اس کا وصی اور تابعِ فرمان ہوں۔ تو جس کا وصی اتنا بلند ہو گا اس کا نبی کیسا ہو گا ـــ ؟ تم انبیاء و مرسلین سے کیا پوچھتے ہو۔ ابھی وہ وصیِ نبی کی منزل تک نہیں پہونچے۔ تو نبی کی منزل کیا بتائیں گے۔

پہچانا آپ نے علیؑ کا مرتبہ ـــ ؟ اب مجھے کہنے دیجیے کہ جب انبیاءؑ و مرسلین، علیؑ کے عرفان و ایمان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، تو اُمّت کے گنہگاروں کو یہ حوصلہ کہاں سے پیدا ہو گیا کہ وہ علیؑ کے ایمان و کردار کا مقابلہ کریں۔

علیؑ تو علیؑ ـــ وہ تو صاحبِ منصب ہیں۔ وصیٔ نبی ہیں۔ امامِ وقت ہیں ـــ امیر المومنین ہیں۔ صاحب امر ہیں۔ ساقیٔ کوثر ہیں۔ مِنْ عِنْدَہٗ علم الکتٰب ہیں۔ فاتح خندق و خیبر ہیں ـــ مجاہدِ بدر و اُحد ہیں ـــ مولودِ کعبہ ہیں۔

انبیاء و مرسلین علیؑ کی زوجہ کے مقابلہ میں نہیں لائے جا سکتے ـــ میں کہتا تو دنیا کفر کا فتویٰ لگا دیتی، لیکن کیا کروں۔ خدا کا رسولؐ کہہ رہا ہے " اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی فاطمہؑ کا کوئی ہمسر نہ ہوتا۔ آدمؑ ہوں یا کوئی اور۔"

آدمؑ و غیرِ آدمؑ کی وسعت دیکھیے، اور پھر سیّدہؑ کی عظمت کا اندازہ

لگائیے ـــــ پوری کائنات میں کوئی ایسا نہیں ہے جو عظمتِ زہرؑا کا مقابلہ کر سکے۔ تو اے اربابِ کرم! ذرا غور کرو جس کی زوجہ ساری دنیا سے افضل و برتر ہو وہ شوہر کتنا بلند ہوگا ـــــ زوجہ پھر زوجہ ہوتی ہے اور شوہر پھر شوہر ہوتا ہے۔ اور وہ بھی کیسی زوجہ اور کیسا شوہر ـــــ؟ یہ رشتہ وہ نہیں ہے جسے ہم نے اور آپ نے بغیر سوچے سمجھے کسی غرض سے قائم کر دیا ہو۔ یہ وہ رشتہ ہے جسے عرش اعظم پر دیکھ بھال کر رب العالمین نے قائم کیا ہے ـــــ اب فاطمہؑ دنیاوی رشتہ سے زوجۂ علیؑ نہیں ہیں، بلکہ خدائی رشتہ سے ہیں۔ اور علیؑ دنیاوی اعتبار سے شوہرِ زہرؑا نہیں ہیں بلکہ مالک کے اہتمام سے ہیں۔

اہلِ دنیا سوچ سکیں تو سوچیں کہ کائنات میں کوئی اس شان کی زوجہ اور اس شان کا شوہر پیدا ہوا ہے یا نہیں ـــــ اور اگر نہیں ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس گھر میں زوجہ بھی بے مثال ہے اور شوہر بھی بے نظیر۔

ظاہر ہے کہ اس بے مثل و بے نظیر رشتے سے جو نسل عالمِ ظہور میں آئے گی وہ کیسی بلند و بالا ہوگی۔

شاید یہی وجہ تھی کہ قدرت نے فاطمہؑ کو اولاد بھی لاجواب دی۔ نہ ہمت میں حسینؑ جیسا کوئی پیدا ہوا۔ نہ خُلق میں حسنؑ جیسا، نہ حوصلہ میں زینبؑ جیسا کوئی نظر آیا، نہ عزم میں اُمِ کلثوم جیسا۔ ہر فرد ہر اعتبار سے کامل و مکمل۔

اب مجھے کہنے دیجیے کہ عظمتوں نے ساری کائنات کا چکر لگانے کے بعد آخر میں زہرؑا کی ڈیوڑھی پر ڈیرے ڈال دیے اور اب صبحِ قیامت تک یہ خیمۂ فضیلت اُکھڑنے والا نہیں ہے۔ دنیا مٹتی ہے تو مٹ جائے لیکن درِ زہرؑا کی عظمت بہرحال "قائم" رہے گی۔

بات کو آخری منزل تک پہونچانے سے پہلے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اسلام میں معرفت پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے؟ خدا کی معرفت ۔ نبی کی معرفت۔ امام کی معرفت۔ اور ہر معرفت کی انتہائی تاکید ــــ حد ہوگئی کہ مولائے کائنات نے یہاں تک فرمایا کہ: "اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُہٗ"

(دین کی ابتدا اس کی (اللہ کی) معرفت ہے) (نہج البلاغہ خطبہ۱)

دین کی ابتدا ہی معرفت سے ہوتی ہے۔ معرفت نہیں تو گویا دین ہی نہیں ــــ معرفت نہیں تو مذہب ہی نہیں۔

بات صرف یہ ہے کہ انسان کا کردار اُس کی معرفت ہی کے سانچے میں ڈھلا کرتا ہے۔ جیسا عرفان ہوگا ویسا ہی کردار بھی ہوگا۔ ایک انسان کے بارے میں آپ طے کرلیں کہ یہ حقیر فقیر ہے تو نہ کبھی اس کی تعظیم کریں گے، نہ اس سے مرعوب ہوں گے اور نہ اسے خاطر میں لائیں گے۔ لیکن ایک آدمی کے بارے میں اگر یہ فیصلہ کرلیں کہ یہ صاحبِ عظمت و جلالت ہے تو خواہ مخواہ اس کی تعظیم بھی کریں گے۔ اس کی بات پر عمل بھی کریں گے ــــ بے توجہی میں کردار مشکوک رہتا ہے اور انسان کا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا۔

یہ انسان قابلِ تعظیم ہے یا لائقِ تذلیل ـــــ اس کی بات پر عمل ہونا چاہیے، یا نہیں۔ لیکن معرفت کے بعد یہ شبہات خود بخود دل سے نکل جاتے ہیں اور ضمیر کو ایک طرح کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کردار سازی بھی انتہائی آسان ہو جاتی ہے۔

اسلام کا منشا بھی یہی تھا کہ ہمارے دائرہ میں قدم رکھنے والا، بلا معرفت قدم نہ رکھے۔ آئے تو مکمل معرفت لے کر آئے تاکہ عمل کی منزل میں ہمیں تاکید نہ کرنا پڑے، بلکہ اس کا عرفان خود اسے عمل پر آمادہ کرے۔

یہی تو راز ہے کہ جن لوگوں کو عرفانِ رسولؐ حاصل تھا وہ اپنی زندگی کی ایک ایک سانس کو مرضیٔ رسول کے سانچے میں ڈھالے ہوئے تھے اٹھیں تو مرضیٔ رسولؐ دیکھ کر، بیٹھیں تو مرضیٔ رسولؐ پہچان کر۔ جئیں تو رسولؐ کی راہ میں اور مریں تو رسولؐ کی راہ میں۔

تفصیلی بیان کا وقت نہیں ہے ورنہ ایسی بیشمار مثالیں پیش کی جا سکتی تھیں جہاں عظمتِ کردار اور بلندیٔ عرفان کے یہ نمونے نظر آتے لیکن یہاں تو صرف ایک منزل کی طرف اشارہ کرنا ہے جہاں کمالِ عرفان کا عالم یہ ہے کہ بپھرا ہوا شیر قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اب مولا کی مرضی نہیں ہے۔

عباسؑ علمدار اگر صرف سپاہی ہوتے اور صاحبِ عرفان نہ ہوتے تو کربلا کی جنگ تیسری محرم کو ختم ہو جاتی، لیکن یہ معرفت ہی کا معجزہ تھا کہ فرات سے خیمے ہٹ گئے اور غازی کی پیشانی پر بل نہیں آئے جب

میرے مولا کی یہی مرضی ہے تو میں کون بولنے والا ـــ !

تاریخِ کربلا میں بیشمار مواقع آئے ہیں جہاں عباسؑ نے اپنے کمالِ عرفان کا ثبوت دیا ہے اور دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ معرفت سے ہٹ کر بہادری اور ہوتی ہے اور معرفت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی شجاعت اور ـــ بے معرفت جنگ کیا کرتے ہیں اور اہلِ معرفت جہاد ـــ جنگ و جہاد کے اس فرق نے کربلا کے سمجھنے کا راستہ کھول دیا کہ اُدھر طاقت کے بھروسے پر جنگ ہو رہی تھی اور ادھر عرفان کے اعتماد پر جہاد یہی وجہ تھی کہ ادھر کا کوئی ایک بھی فرد اُدھر نہیں گیا۔ لیکن اُدھر کا حُر معرفت حاصل ہوتے ہی تڑپ کر حسینؑ کی خدمت میں آگیا ـــ اُدھر کا زُہیر کھنچ کر مولا کی بارگاہ میں آگیا اور ایسا آگیا کہ شبِ عاشور عباسؑ جیسے وفادار سے زُہیر نے کہہ دیا۔ فرزندِ علیؑ! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بابا نے آپ کو کس دن کے لیے مہیا کیا تھا۔

یہ سُننا تھا کہ ایک مرتبہ شیر کو جلال آیا۔ غیرتِ ہاشمی خون بن کر رگوں میں دوڑنے لگی ـــ پشتِ فرس پر انگڑائی لی۔ رکابیں ٹوٹ گئیں۔

فرمایا: زُہیر! آج کیا شجاعت کا جوش دلاتے ہو ـــ ذرا اس رات کی صبح تو ہونے دو پھر دیکھنا، عباسؑ کیا ہے اور عباسؑ کی وفا کیا ہے ـــ ؟

لیکن عزادارو! یہ جذبہ دل کا دل ہی میں رہ گیا اور مشکِ سکینہؑ کی ذمہ داریوں نے غازی کو جنگ نہ کرنے دی۔ عباسؑ کی تلوار نکلتی تو دنیا خیبر کی جنگ کا نقشہ دیکھتی ـــ مگر وہ غازی کیا کرے جس کے ہاتھوں میں

ذوالفقارِ حیدری کے بجائے مشکِ سکینہ ہو اور نظر کے سامنے فوجِ دشمن کے بجائے بھتیجی کی معصوم صورت ہو جو بار بار کہہ رہی ہو۔ چچا جنگ کا موقع نہیں ہے ـــــ چچا لڑائی میں دیر مت کیجیے گا ـــــ چچا آپ کی بھتیجی بہت پیاسی ہے ـــــ اب گلے سے آواز نہیں نکلتی ـــــ زبان اینٹھ گئی ہے۔ ہونٹ خشک ہو گئے ہیں ـــــ اور عباسؑ جب اس منظر کا تصور کر لیتے ہیں تو کلیجہ پانی ہو جاتا ہے۔

ساقیٔ کوثر کا فرزند زندہ رہے اور مولا کی لاڈلی پیاس سے بے جان ہو جائے ـــــ عباسؑ اس زندگی سے کیا فائدہ ـــــ بڑھو ـــــ جلدی بڑھو ـــــ سکینہ کے شکوہ سے پہلے پانی خیامِ حسینی میں پہونچ جائے

علمدار نے مولا کو سلام کیا ـــــ اجازت لی ـــــ مشک و علم کو سنبھالا ـــــ میدان کا رُخ کیا۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے فرات پہونچے۔ مشکیزہ کو بھرا۔ چُلّو میں پانی لیا ـــــ پانی میں حسرتوں کی تصویر نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سکینہ سامنے کھڑی ہوئی کہہ رہی ہے۔ چچا جلدی چلیے بچّے خیمہ میں پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ چچا دیکھیے! یہ آپ کی سکینہ بھی پیاسی ہے۔ چچا! میرا بھیّا جھولے میں پیاس سے تڑپ رہا ہے۔ عباسؑ نے پانی کو پھینکا، ہاتھ کو دامن سے خشک کیا۔ وفا نے آواز دی ـــــ عباسؑ! کہیں سکینہ تیرے ہاتھوں کی تری نہ دیکھ لے۔ بھتیجی کو شکوہ ہوگا چچا کے ہاتھ میں پانی کی تری کیسے آئی۔ گھوڑے کا رُخ موڑا۔ اب تیر ترائی سے بلندی کی طرف آرہا ہے۔ چار ہزار کا پہرہ اور اس میں ایک علمدار ـــــ

کوئی تلوار لیکر بڑھا، کسی نے نیزہ سنبھالا، کسی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہوئی ۔۔ اور علیؑ کا شیر نہایت اطمینان سے صفوں کو چیر کر باہر نکل آیا۔ گھوڑے کو دوڑایا ۔۔۔ کیسے خیمہ تک پہونچ جاؤں۔ ایک مرتبہ ایک ظالم نے چھپ کر وار کیا۔ ایک ہاتھ قلم ہوگیا۔ علم کو دوسرے ہاتھ سے سنبھالا۔ گھوڑے کو اور تیز کیا۔ راستے میں دوسرا شانہ بھی قلم ہوگیا۔ عباسؑ نے پرواہ نہ کی ۔۔ تیزی سے خیمے کی طرف بڑھتے جارہے ہیں، لیکن، اولاد والو ! ایک مرتبہ ایک تیر مشکیزہ پر آکر لگا اُدھر پانی بہا ۔۔ اِدھر خون پانی ہوگیا ۔۔۔ شرم سے سر جھکا لیا۔ ہائے سکینہ کو کیا جواب دوں گا ۔۔ بچی کو کیسے منہ دکھاؤں گا ۔۔ مولا کی لاڈلی نے مجھ سے پانی کا سوال کیا اور میں پورا نہ کرسکا۔

سر کا جھکنا تھا کہ ایک ظالم نے گرزِ آہنی مارا ۔۔۔ مسجدِ کوفہ کی تاریخ دُہرائی گئی ۔۔۔ عباسؑ کا سر شگافتہ ہوگیا۔ خون کا فوّارہ جاری ہوا۔ گھوڑے کی طرف رُخ کرکے کہا: اے اسپ باوفا پلٹ چل۔ اب عباسؑ خیمے میں جانے کے لائق نہیں رہا۔ اب سکینہؑ کو کیا منہ دکھاؤں گا ۔۔ فرات کی طرف بڑھے۔ چند قدم چلے تھے کہ طاقت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ گھوڑے سے زمین کی طرف چلے۔

اربابِ عزا ! مجھ میں ہمت نہیں کہ لفظوں میں دُہرا سکوں۔ آپ سوچ سکیں تو سوچیں۔ یہ گھوڑے سے کون گر رہا ہے۔ وہ ۔ جس کے ہاتھ نہیں ہیں۔ جس کے شانے قلم ہوچکے ہیں۔ جس کا سر گُرز سے زخمی ہے

دل چاہتا ہے، آواز دوں۔ یا علیؑ! نجف سے آئیے۔ عباسؑ کو سہارا دیجیے ___ آپؑ کے لال کے ہاتھ نہیں ہیں کہ زمین پر ٹیک سکے۔ آپ کے فرزند کا سر زخمی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کس نے سہارا دیا اور عباسؑ کس طرح زمین تک پہونچے۔ بس حسینؑ کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ مولا آئیے۔ آواز کانوں سے ٹکرائی اور ہاتھ کمر تک پہونچ گئے ___ عباسؑ! اس آواز نے کمر توڑ دی ___ بھیا ___! حسینؑ اکیلا رہ گیا ___ میرے علمدار! اب دشمن طعنے دے رہے ہیں۔ حسینؑ! تمھارا علمدار کہاں ہے ___؟ عباسؑ۔! بتاؤ میں کیا جواب دوں؟

حسینؑ دل ہی دل میں بین کرتے رہے۔ ایک مرتبہ اُٹھے۔ کمر کو کس کے باندھا۔ میدان کا رُخ کیا۔ گرتے پڑتے چلے۔ راستے میں کوئی چیز اُٹھا کر سینے سے لگاتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سرہانے پہونچے۔ سر زانو پر رکھا۔

عزادارو! ۔ بتاؤں کیسا سر۔ وہ سر جس پر گرز لگ چکا ہے ___ وہ سر جو دو پارہ ہو چکا ہے ___ وہ سر جس سے خون کا فوارہ جاری ہے ___ کیسے حسینؑ نے زانو پر رکھا، اور کیسے اس منظر کو دیکھا ___؟ اسے فرزندِ زہراؑ کا دل ہی جانتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عباسؑ نے سر ہٹا لیا ___ اللہ غلام کا سر اور آقا کا زانو ___ مولا دیکھیں گے تو بےچین ہو جائیں گے۔ شاید اشارہ ہو کہ آقا میرا سر

آپؑ کے زانو پر ہے، آپؑ کا سر کس کے زانو پر ہو گا ــــ؟ مظلومیت نے آواز دی۔ عباسؑ! گھبراؤ نہیں جب حسینؑ گھوڑے سے گریں گے تو دکھیا ماں آئے گی اور اپنے لال کا سر اپنے آغوش میں لے لیگی۔

عزادارو! مجلس تمام ہو رہی ہے۔ بھائی بھائی میں گفتگو جاری ہے عباسؑ وصیتیں کر رہے ہیں ــــ مولا میرے لاشے کو خیمے تک نہ لے جائیے گا۔ بھیاؑ۔ ! کیوں؟۔ آقا! مجھے سکینہؑ سے شرم آتی ہے۔ میں نے بچی سے پانی کا وعدہ کیا تھا، لیکن پورا نہ کر سکا۔

میں کہوں گا عباسؑ! آپ نے حدِ وفا کا ثبوت دیا۔ اب یہ بچوں کا مقدّر ہے۔ میرے شیر شرم کی کیا بات ہے۔ جائیے کم از کم بھتیجی آپ کی وفاداری کو دیکھ تو لے۔

لیکن عزادارو! شاید عباسؑ کا مقصد یہ بھی ہو کہ آقا ۳۴ سال کے جوان کا لاشہ ہے اور آپؑ کی ٹوٹی ہوئی کمر۔ یہ لاشہ کیسے اُٹھے گا؟ مولا! مجھے فرات کے کنارے پڑا رہنے دیجیے۔

وصیت تمام ہوئی۔ عباسؑ باتیں کرتے کرتے چُپ ہوئے اور حسینؑ کی زبان پر مرثیہ آگیا۔

عباسؑ! آج سے وہ آنکھیں چین سے سوئیں گی جو تیرے خوف سے جاگا کرتی تھیں، اور بھیا! اب تیری بہنیں جاگیں گی، انھیں سونا نصیب نہ ہو گا ــــ عباسؑ! اب تیری سکینہؑ بھی نہ سو سکے گی۔

ہائے وہ شامِ غریباں کا سناٹا ــــ وہ زینبؑ کا پہرہ۔ اور وہ

سکینہ کی بیتابی ــــ چچا، تم کہاں ہو ــ؟ ظالموں کے نرغہ میں اکیلے مجھے کیسے نیند آئے گی ــــ میں سوؤں گی تو کوئی مجھے سونے نہ دے گا۔ میں آرام کروں گی تو ظالم مجھے جگا دیں گے۔ اور میں رونا بھی چاہوں گی تو شمر ملعون تازیانوں سے اذیت دے گا۔

عزیرو! جو سکینہؑ نے سوچا تھا وہی ہوا ــــ شامِ غریباں کے سنّاٹے میں جب بابا کو آواز دیتی مقتل میں آئی اور بابا کے لاشہ بے سر سے لپٹ کر رونا شروع کیا تو اشقیاء تازیانے لے کر آگے بڑھے اور چاروں طرف سے بچّی کی پشت پر تازیانوں پر تازیانے پڑنے لگے۔ بچّی فریاد کرنے لگی چچا آپ کے نہ ہونے سے آپ کی سکینہ تازیانوں پر تازیانے کھا رہی ہے۔

"اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۰"

۱۰

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَفْضَلِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ ۔ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ الدَّائِمَۃُ الْبَاقِیَۃُ عَلٰی اَعْدَائِہِمْ اَجْمَعِیْنَ مِنَ الْاٰنَ اِلٰی قِیَامِ یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ"

"اور، محمدؐ صرف اللہ کے رسول ہیں۔"

قرآنِ حکیم کے اس فقرہ کی روشنی میں آج یہ واضح کرنا ہے کہ رسالت کیا ہے اور اس کی ذمّہ داریاں کیا ہیں۔؟

مالکِ کائنات نے انبیاء و مرسلین کا سلسلہ کیوں قائم کیا، اور انبیاء و مرسلین نے کن ذمّہ داریوں کو کس طرح ادا کیا، اور پھر ان تمام نمائندگانِ الٰہی

کے درمیان حضورؐ سرورِ کائنات کی منزل اور آپؐ کی ذمّہ داریاں کیا ہیں اور آپؐ نے ان ذمّہ داریوں کو کس طرح ادا کیا۔

ابتدائی طور پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ رسالت کی ضرورت کیا ہے اور اس بگڑی ہوئی دنیا میں اللہ کی طرف سے نمائندوں کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ تاریخِ انسانیت اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی کوئی نمائندۂ الٰہی آیا اور اس نے دنیا کی اصلاح کی کوشش کی، تو اہلِ دنیا نے اسے اس قدر ستایا کہ اکثر اوقات بارگاہِ احدیت میں فریاد کی اور کبھی کبھی بددُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔

حضرت آدمؑ کو بیٹے کا داغ اُٹھانا پڑا۔ حضرت نوحؑ کو پتھر کھانا پڑے۔ حضرت ابراہیمؑ کو آتشِ نمرود میں جانا پڑا۔ حضرت موسٰیؑ کو غریب الوطنی کی زندگی گذارنا پڑی۔ حضرت عیسٰیؑ کو ساتھیوں کی بے مہری سے سابقہ پڑا۔ خود حضورؐ سرورِ کائنات کبھی پتّھر کھاتے رہے، کبھی کانٹوں پر چلتے رہے، کبھی سر پر کوڑا کرکٹ برداشت کرتے رہے اور اسی طرح ۲۳ سال تبلیغ کر کے دنیا سے رُخصت ہو گئے۔

سوال صرف یہ ہے کہ ایسے حالات میں کیا ضروری تھا کہ پروردگارِ عالم انبیاء و مرسلین کو بھیجتا ہی رہتا اور اہلِ ستم کے لیے برابر ایک نشانۂ ستم فراہم ہی ہوتا رہتا۔ ایک دو دور میں اہلِ زمانہ کی روش دیکھنے کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا جاتا۔ دنیا راہِ راست پر آتی یا نہ آتی، کم از کم اللہ والے تو ان مظالم سے محفوظ رہ جاتے اور انھیں تو ستمِ روزگار کا نشانہ نہ بننا پڑتا لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ مصلحتِ الٰہی کو ربّ العالمین ہی بہتر جانتا ہے لیکن ایک نکتہ پہ

ہمیں اور آپ کو بھی توجہ دینا ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی انسان کسی شخص کو اپنے گھر مدعو کرے اور دسترخوان پر مختلف قسم کے سامان چُن دے۔ ان میں کھانے کا سامان بھی ہو اور ہاتھ دھونے کا پانی بھی۔ لذیذ غذائیں بھی ہوں اور مکھیوں کو مارنے کی دوا بھی ــــ خود گھر میں بیٹھنے کی جگہ بھی ہو اور صاف شفاف بیت الخلاء بھی۔ تو میزبان کا اخلاقی فرض ہے کہ مہمان کو گھر کی پوزیشن سے باخبر کردے اور اسے یہ بتا دے کہ رہنے کی جگہ کون سی ہے اور سونے کی جگہ کون سی۔ ملاقات کا کمرہ کون سا ہے اور بیت الخلاء کونسا۔ نہانے کی جگہ کہاں ہے اور ہاتھ دھونے کی جگہ کہاں ــــ غسل کرنے کا حوض کون سا ہے اور منہ ہاتھ دھونے کا حوض کونسا ــــ دسترخوان پر کھانے کا سامان کیا ہے اور نمائش کا سامان کیا ــــ غذا کون سی ہیں اور مکھی مارنے کی دوا کونسی ــــ

ایسا نہ کرنے سے اگر مہمان سے کوئی غلطی ہوگئی اور اس نے مکان کو گندہ کر دیا ــــ یا زہریلی دوا کھا کر مر گیا تو اس کی موت کی ذمّہ داری خود اس پر عائد نہ ہوگی، بلکہ اس کا خونِ ناحق اس میزبان کے سر پر ہوگا جس نے دعوت میں بُلایا اور حالات سے باخبر نہیں کیا۔

یہ تو وہاں کے حالات ہیں جہاں مہمان خود بھی دنیا کا تجربہ رکھتا ہے اور مختلف چیزوں کو پہچانتا ہے۔ صرف مقامی سامان یا مقامی رسم و رواج سے باخبر نہیں ہے۔ لیکن اگر مہمان کسی بات سے باخبر نہ ہو اور وہ مطلق طور پر ناواقف ہو تو میزبان کی اخلاقی ذمّہ داری کہیں زیادہ بڑھ

جاتی ہے اور اخلاقی دنیا میں مہمان کی موت میزبان کی طرف سے اقدامِ قتل کا درجہ پیدا کر لیتی ہے۔

عبد و معبود، خالق و مخلوق اور خداوندہ کا رشتہ یہی ہے۔ مالکِ کائنات نے انسان کو عدم سے نکال کر وجود کی بستی میں پہونچایا ـــــ بستی وہ جہاں اچھی بُری، مضر اور مفید، قابلِ استعمال اور ناقابلِ استعمال اشیاء کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ زمین سے آسمان تک مخلوقات کا ایک سلسلہ ہے ـــ ہوا سے لیکر فضا تک کارآمد چیزوں کا ایک تسلسل ہے اور مہمان ایسا ناواقف کہ اسے خود اپنی بھی خبر نہیں ہے۔ کوئی نام رکھ دے تو اپنے نام سے باخبر ہو جائے ورنہ اپنا نام بھی نہیں جانتا۔ کوئی غذا دیدے تو کھالے، ورنہ اپنی زندگی کا بھی انتظام نہیں کر سکتا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ میرا بستر کہاں ہے اور دستر خوان کہاں ـــــ ؟ فطرت نے اس حد تک راہنمائی کی ہے کہ تیری ماں تیری پوری دنیا ہے ـــــ اسی کا سینہ تیرا دستر خوان ہے ـــــ اور اسی کی گود تیرا بستر ـــــ اسی کا وجود تیرے آرام کی جگہ ہے اور اسی کا وجود تیرے ضروریات زندگی کی منزل لیکن ایک وہ منزل بھی آتی ہے جب انسان اس مکان سے منتقل ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کی دنیا آغوشِ مادر سے پھیل کر سینۂ گیتی تک پہونچ جاتی ہے اس کا وجود صرف ماں سے متعلق نہیں ہے۔ اب اس کی دنیا صرف سینہ و آغوشِ مادر نہیں ہے بلکہ بطنِ گیتی اور سینۂ زمین ہے۔

غنیمت ہے کہ ضروریات کے ساتھ شعور نے باقاعدہ ترقی نہیں کی

اور بچہ اپنے ضروریات میں ماں باپ اور تربیت کرنے والوں کا محتاج رہا اور اُنھوں نے اُسے نیک و بد سے آگاہ کرنے کے ساتھ دونوں کے ساتھ برتاؤ کا طریقہ بھی سکھا دیا لیکن یہ سلسلہ بھی کب تک ہے؟

دھیرے دھیرے شعور نے ترقی کی۔ عقل پختہ ہوئی۔ ادراک کو کمال حاصل ہوا۔ اور ضروریاتِ زندگی نے خود مختاری کی دعوت دی۔ بچہ صحنِ خانہ سے نکل کر میدانِ دنیا تک پہونچا۔ حالات نے ایک خاندان کے افراد کو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا ـــــ اور ذہن نے مضطرب ہو کر فریاد کی ـــــ اب کون بتائے کہ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے ـــــ؟ اب کون سکھائے کہ کیا کھاؤں اور کیا نہ کھاؤں ـــــ اب کون سمجھائے کہ کہاں رہوں اور کہاں نہ رہوں ـــــ پیدا کرنے والے نے بندے کا اضطراب دیکھا ـــــ رحمت کو جوش آیا ـــــ اور ایک مرتبہ ندائے قدرت آئی ـــــ میرے بندے گھبرانا نہیں ـــــ جس نے کل سینہ و آغوشِ مادر کا پتہ بتایا تھا ـــــ جس نے کل صحنِ خانہ میں رینگنا سکھایا تھا ـــــ جس نے کل ماں باپ اور تربیت کرنے والوں کو جذبۂ محبت و ہمدردی سے نوازا تھا ـــــ وہ آج بھی زندہ ہے اور تیرے حالات کو جانتا ہے اور تجھ پر رحم کرنے کے لیے تیار ہے ـــــ میرے بندے! اب تیری عقل کامل ہو گئی ہے ـــــ تیرا شعور پختہ ہو گیا ہے ـــــ اب تجھے محنت کرنا پڑے گی ـــــ نظامِ فطرت محنت و مشقّت چاہتا ہے ـــــ وقارِ انسانیت کسب و طلب کا مطالبہ کر رہا ہے ـــــ اب وہ دن گئے جب دوسروں

کے سہارے زندگی گذار رہا تھا ـــ اب وہ وقت نہیں رہا جب تو والدین کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا تھا۔ جب تیری عقل ناقص تھی، تیرا دماغ وسیلوں میں اُلجھ رہا تھا تو میں نے تجھے وسیلہ ہی کے حوالے کر دیا تھا۔ تیرے والدین کو اصولِ تربیت سکھائے اور تجھے اسی وسیلہ میں گم رہنے دیا۔ لیکن اب تو تیری عقل کامل ہو گئی ہے۔ اب تیرے شعور میں یہ بات آنے لگی ہے کہ وسیلہ اور ہے، اصل اور ـــ راستہ اور ہے، منزل اور ـــ والدین اور ہیں، ربّ العالمین اور ـــ اب تجھے زندگی کا سبق ہم سے لینا ہے غیر سے نہیں ـــ اپنا ربط ہم سے قائم کرنا ہے، دنیا سے نہیں ہم نے تجھے نیک و بد سے آگاہ کرنے کے لیے اپنی طرف سے رسالت و نبوت کا سلسلہ قائم کر دیا ہے، تاکہ تو گمراہ بھی نہ ہونے پائے اور میرے دامنِ انصاف پر دھبّہ بھی نہ آنے پائے ـــ تو بھی راہِ راست پر لگ جائے اور میں بھی یہ کہہ سکوں کہ مہمان بلایا ہے تو مہمان نوازی کا سارا انتظام بھی کر دیا ہے۔

یاد رکھیے! نبوّت و رسالت اسی پیغام رسانی کا نام ہے جہاں اللہ والے، اللہ کے مہمانوں کو اچھے بُرے سے باخبر بناتے ہیں اور انسانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ اس بھری پُری دنیا میں کون سی چیز قابلِ استعمال ہے اور کون سی چیز ناقابلِ استعمال۔ بندہ ان حقیقتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسے ان حالات کی مکمل خبر نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی کو نہیں پہچانتا تو اپنے ضروریات کا کیا اندازہ کرے گا ـــ یہ ہماری ذمّہ داری ہے کہ ہم اسے راہ و چاہ سے باخبر کریں۔ ہم نے

انبیاء و مرسلین کو اسی لیے بھیجا ہے کہ وہ تمھیں راہِ راست پر لائیں اور اچھے برُے سے آگاہ کریں۔

اب یہ تمھارا انصاف تھا کہ تم نے اپنے مہربان و ہمدرد افراد کو بھی اپنے سماج میں جگہ نہیں دی اور انھیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے رہے ان کا ظرفِ اخلاق اتنا وسیع تھا کہ انھوں نے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کیں لیکن تمھارا ساتھ نہیں چھوڑا اور تمھیں سیدھے راستے پر لگانے کی کوشش کرتے رہے۔

اسی منزل سے یہ فیصلہ بھی آسان ہو جاتا ہے کہ نمائندۂ الٰہی کو کیسا ہونا چاہیے ــــــ کہ اگر نیک و بد سے باخبر کرنے والا خود بے خبر ہوگا تو اُس کی بات بے اثر ہوگی اور اگر سیدھے راستے پر لگانے والا خود بہکا ہوا ہوگا تو اُس کی نمائندگی ایک دھوکا ہوگی، ہدایت نہ ہوگی۔ مالک سے بہتر اس حقیقت سے کون باخبر ہوگا۔

اُس نے جتنے انبیاء و مرسلین بھیجے ہر ایک کو عالم بھی پیدا کیا اور معصوم بھی۔ اب جتنی اہم ذمّہ داری ہوگی اتنی ہی زیادہ عصمت اور آگاہی ضروری ہوگی ــــــ جس کی ذمّہ داری ایک زمانے ــــــ ایک دَور ــــــ ایک خاندان ــــــ ایک قبیلہ سے متعلق ہوگی۔ اس کی منزلِ کمال بھی اتنی ہی بلند ہوگی۔ اور جو ساری کائنات کا صبحِ قیامت تک کا ذمّہ دار ہوگا۔ اس کی عظمتِ کردار اور بلندیٔ منزل کا پتہ لگانے کے لیے عرش و فرش کی وسعتوں اور صبحِ قیامت تک کی ضرورتوں کا اندازہ لگانا پڑے گا ــــــ اور جب تک یہ وسعتیں

ذہن میں نہ آجائیں مقامِ محمدیّت کا اندازہ ناممکن ہے۔

اِس ظرف کے بندے کہاں پیدا ہوں گے جو دنیا کی اصلاح کی خاطر اتنے مصائب کا سامنا کریں ـــــ اور امت کے سدھارنے کیلئے کانٹوں پر چلنا گوارا کریں ـــــ یہی ظرف کی بلندی تھی جس نے کسی کو صفی اللہ بنادیا توکسی کو نجی اللہ ـــــ کسی کو خلیل اللہ بنایا، توکسی کو ذبیح اللہ ـــــ کسی کو کلیم اللہ بنایا، توکسی کو روح اللہ ـــــ اور جب سارے کمالات ایک منزل پر سمٹ کر آگئے تو حبیب اللہ کا درجہ دیدیا۔

عزیزانِ محترم ـــــ! جب رسالت ونبوّت نیک و بد سے آگاہ کرنے کا نام ہے توجب تک اس کائنات میں انسان زندہ رہیں گے اور نیک و بد کا تصور رہے گا انبیاء اور رسولوں کی ضرورت بھی رہے گی ـــــ لیکن نہ جانے کیا مصلحتِ الٰہی ہے کہ انسان زندہ رہ گئے۔ نیک و بد کا وجود باقی رہ گیا، اور اس نے حضرت محمد مصطفٰے پر نبوّت و رسالت کا خاتمہ کردیا۔

دل چاہتا ہے کہ پوچھوں، میرے مالک ـــــ! کیا اب بندوں کے لیے نیک و بد کا امتیاز ضروری نہیں ہے ـــــ کیا اب اچھے برے کا فرق بیکار ہوگیا ہے ـــــ کیا شریعتِ اسلام معطّل کردی گئی ہے ـــــ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر رسالت ونبوّت کا سلسلہ کیوں بند کردیا گیا ہے ـــــ؟

عجب نہیں قدرت جواب دے ـــــ تونے غور نہیں کیا جب تک دسترخوان پر نئے نئے مہمان آتے رہے۔ مختلف دل و دماغ کے لوگ مدعو ہوتے رہے۔ اس وقت تک ایک ایسے آدمی کی ضرورت رہی جو انھیں ان تمام

خصوصیات سے باخبر کرتا رہے۔ اور جب آنے والے باخبر ہو گئے ـــــ اچھے برے کی تمیز کرنے کی صلاحیت والے ہو گئے۔ تو صرف اس آدمی کی ضرورت ہے جو انھیں غلط چیزوں کے استعمال سے روکتا رہے ـــــ اور میں نے یہی انتظام کیا ہے کہ جب تک اونچے اونچے دماغ کے انسان پیدا ہوتے رہے۔ انھیں قدم قدم پر راہبری کرنے والے ہادی و رہنما دیے گئے اور جب ذہن کمال کی اس منزل پر پہونچ گئے کہ ایک بیان ساری نسلوں کے لیے کافی ہو جائے تو اب صرف ان افراد کی ضرورت رہ گئی ہے جو نامناسب چیزوں کے استعمال پر پابندی لگاتے رہیں ـــــ یہ پیغام تو نہیں ہے لیکن پیغام ہی کا ایک جزو ہے ـــــ رسالت نہیں ہے لیکن رسالت ہی کا ایک شعبہ ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ میں نے غدیر خم کے میدان میں ولایتِ علیؑ کا

اعلان کرانے کے لیے "یا ایُّھا الرَّسُولُ" کہہ کر پکارا تھا ـــــ تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ رسولؐ دنیا سے جا رہے ہیں لیکن رسالت کی ذمّہ داریاں نہیں جا رہی ہیں ـــــ پیغام رسانی کا کام ختم ہو چکا ہے لیکن تحفّظِ رسالت کا کام باقی ہے اور اسی لیے علیؑ کی جانشینی کا اعلان کرا رہا ہوں ـــــ اور اس اہمیّت کے ساتھ کہ اگر یہ نہیں کیا تو گویا کچھ نہیں کیا

اب مجھے کہنے دیجیے کہ غدیرِ خم کا میدان دُہری عظمتوں کا اعلان کر رہا تھا۔ ایک طرف یہ اعلان ہو رہا تھا کہ تکمیلِ دینِ نبیؐ کے ذمّہ تھی اور وہ ہو گئی اور دوسری طرف یہ اعلان ہو رہا تھا کہ تبلیغِ دین کا کام امام کے ذمّہ ہے اور اس کا سہرا علیؑ کے سر باندھا گیا ہے۔

تکمیل و تبلیغ کے اسی فرق کا اندازہ نہ کرنے کا نتیجہ تھا کہ قوم نبوّت و امامت کا فرق بھی محسوس نہ کر سکی اور اسے امامت کی ذمّہ داریوں کا بھی صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔

مرسلِ اعظمؐ اپنی تمام زندگی . . . دینِ حق کی تبلیغ بھی کرتے رہے اور قوم کو اس پر عمل کرنے کے لیے بھی آمادہ کرتے رہے۔

اس وقت اس سے بحث نہیں ہے کہ کتنے راستے پر آئے اور کتنے نہیں آئے۔ اس وقت تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مرسلِ اعظمؐ نے اپنے فرض کو ادا کر دیا آیتیں آتی رہیں نبیؐ سناتے رہے۔ پیغامات آتے رہے حضورؐ پہونچاتے رہے احکام نازل ہوتے رہے حضورؐ قوم کو عمل پر آمادہ کرتے رہے ـــ یہاں تک کہ غدیرِ خم میں تبلیغ کا سلسلہ تمام ہوا اور دینِ الٰہی کو سندِ تکمیل مل گئی۔ اب اس کے بعد کوئی شریعت نازل ہونے والی نہیں ہے۔ کوئی تازہ حکم آنے والا نہیں ہے، امامت و خلافت کی ذمّہ داری، انھیں احکام کا تحفّظ کرنا اور انھیں پیغامات پر عملدرآمد کرانا ہے اور بس ـــ۔

لیکن اربابِ کرم! ذرا سوچیں کہ امامت کی ذمّہ داری کتنی سخت ہے کہ اب تک آیتیں متفرّق طور پر نازل ہو رہی تھیں ـــ احکام الگ الگ آ رہے تھے۔ پیغامات دھیرے دھیرے آ رہے تھے اور حضورؐ ایک ایک کر کے قوم کو عمل پر آمادہ کر رہے تھے اور تاریخ گواہ ہے ایسی تدریجی تبلیغ میں بھی قوم کی قوّتِ برداشت جواب دے گئی۔ اور ایسے رفتہ رفتہ عمل میں بھی بغاوت کے جذبات اُبھر آئے اور کسی کو نبوّت میں شک ہو گیا کسی نے حضورؐ

کے دماغ پر حملہ کر دیا۔ تو اب امامت کی ذمہ داریاں کتنی سخت ہوں گی کہ امامؑ کو بیک وقت ان تمام احکام پر عمل کرانا ہے جنھیں رسولؐ نے ۲۳ سال میں پیش کیا ہے۔ امامؑ کو بیک وقت ان تمام مشکلات کا سامنا کرنا ہے جن کا سامنا حضورؐ نے ۲۳ سال کی عمرِ تبلیغ میں کیا ہے۔

یاد رکھیے! کہ اگر نبوت کے لیے پہاڑوں جیسا ثبات درکار ہے تو امامت کے لیے ہمالیہ جیسے عزم کی ضرورت ہے۔ اگر نبوت کے لیے سمندر جیسی وسعتِ صدر ضروری ہے تو امامت کے لیے طوفانوں جیسا زور وشور۔ اگر نبوت ثباتِ عزم کی طلبگار ہے تو امامت استقلالِ ارادہ کی متقاضی۔

دنیا نبوت کو پہچانے تو امامت کی بلندی کا اندازہ ہو۔ رسالت کی معرفت حاصل کرے تو امامت کی جلالتِ قدر سمجھ میں آئے۔ ذمہ داریوں کا یہی وہ پہاڑ تھا جسے ہر امامؑ نے اپنے سر پر اٹھایا۔ فرائض کا یہی وہ انبار تھا جس نے ہر منزل پر سر کو بارِ دوش بنایا اور ہر امامِ وقت ہمیشہ قربانیوں کے لیے آمادہ رہا۔

دنیا ان ذمہ داریوں کی قدر نہ کر سکی لیکن رسالت کو تو معلوم تھا کہ میں نے کون سا بوجھ امامت کے سر پر رکھا ہے اور امامت نے میری کس مشکل کو آسان کیا ہے۔ اس لیے دنیا الزامات لگا رہی تھی اور رسالت مسلسل اعلان کر رہی تھی "علیؑ مجھ سے اور میں علیؑ سے ہوں"۔ "حسنؑ مجھ سے اور میں حسنؑ سے ہوں۔ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔

یہ نہ ہوتے تو رسالت منزلِ تعمیل میں کامیاب نہ ہوتی۔ یہ نہ ہوتے تو

تبلیغِ رسالت ناتمام رہ جاتی ـــــ یہ نہ ہوتے تو دینِ الٰہی تباہ و برباد ہو جاتا یہ نہ ہوتے تو قیامت ۶۱ھ ہی میں آجاتی۔ یہ امامت ہی کا زورِ بازو تھا جس نے قیامت کو روکے رکھا اور خود بھی "قائم" رہی۔

یوں تو امامت کا حوصلہ ہر منزل پر قابلِ دید تھا۔ کوفہ کی مسجد ہو، یا مدینہ کا مکان۔ سر شگافتہ ہو، یا جگر کے ٹکڑے ہو جائیں، امامت کے استقلال میں فرق نہیں آیا، لیکن ان حوصلوں کا کمال کربلا کے میدان میں دیکھا جہاں باپ اپنے جوان بیٹے کو بُلا کر آواز دے رہا ہے۔ بُنَیَّ تَقَدَّمْ "بیٹا اکبرؑ اب تم جاؤ"۔ میرے لال! حبیب رخصت ہو چکے مسلم مارے جا چکے، زُہیر نے ساتھ چھوڑ دیا۔ چاہنے والے نہ رہے۔ بیٹا! دل چاہتا ہے کہ اب تمھارا داغ اُٹھاؤں ـــــ عونؑ و محمدؑ بہن کے نورِ نظر ہیں۔ قاسمؑ بھیا کی نشانی ہے، عباسؑ میرا علمبردار ہے، لیکن میرے لال! تم میرے فرزند ہو پہلے تم جاؤ، تاکہ مجھے بہن اور بھائی سے شرمندہ نہ ہونا پڑے ـــــ لیکن دیکھو اکبرؑ! یہ ہے قربانی کی ذمہ داری، کہ میں تمھیں بھیج رہا ہوں ـــــ ورنہ بیٹا! تم پر تمھاری پھوپی کا بھی حق ہے ـــــ پہلے ان سے اجازت لے آؤ ـــــ اکبرؑ باپ کا حکم پاکر خیمہ میں داخل ہوئے۔ کون مورّخ تھا جو اِس داستانِ غم کو نقل کرتا ـــــ؟ کس کے پہلو میں دل تھا جو زینبؑ کے جذبات کا اندازہ کرسکتا ـــــ جذبات نے بڑھ کر ترجمانی کی۔ حالات نے اشارے دیئے۔ ہجومِ مصائب نے قلبِ زینبؑ کے جائزے کا موقع فراہم کیا۔ اکبرؑ سامنے آکے کھڑے ہوئے۔ جس نے اٹھارہ برس مشقتوں سے پالا تھا، اس نے

سر اُٹھا کر چہرہ کو دیکھا ـــــ دل تڑپ گیا۔ ارے اس وقت، میرے لال کے تیور ہی کچھ اور ہیں۔ اس وقت جیسے اکبرؑ کچھ مانگنے آئے ہیں، جیسے میرا لال کچھ سوال کرنا چاہتا ہے۔ ہائے میں اکبرؑ کے سوال کو کیونکر پورا کروں گی۔ دلِ زینبؑ تڑپ رہا ہے۔ کہیں اکبرؑ نے پانی مانگ لیا تو کیا ہوگا ـــــ ؟ میں نے تو کبھی اپنے لال کے کسی سوال کو رد نہیں کیا ـــــ اگر آج اپنے اکبرؑ کے مطالبہ کو پورا نہ کر سکی تو میرا کیا عالم ہوگا ـــــ دل دھڑکتا رہا اور ایک مرتبہ علیؑ کی بیٹی نے ہمّت کر کے پوچھ ہی لیا ـــــ بیٹا کیسے آئے ہو۔ میرے اکبرؑ کیا چاہتے ہو؟ بیٹا خاموش کیوں کھڑے ہو ـــــ بولو، بولو۔ پھوپی نثار ـــــ یہ پھوپی تیرے ہر سوال کو پورا کرے گی ـــــ اکبرؑ نے سر جُھکایا ـــــ

مظلومیت نے آواز دی ـــــ پھوپی جان! آیا نہیں، بابا نے بھیجا ہے۔ ـــــ بیٹا! خیر تو ہے، کیوں بھیجا ہے؟ پھوپی امّاں! بابا نے مجھے سر کٹانے کا حکم دیا ہے۔ میں میدان میں جا رہا ہوں ـــــ بابا کا حکم ہے کہ آپ سے بھی رخصت لوں ـــــ فرمائیے، اب کیا حکم ہے ـــــ؟ آپ نے تو میرے کسی سوال کو رد نہیں کیا ـــــ فرمائیے پھوپی امّاں، اب کیا خیال ہے؟

زینبؑ نے کلیجہ پکڑ لیا ـــــ بیٹا! مجھ سے مرنے کی رضا لینے آیا ہے ـــــ یہ زینبؑ کا مقدّر ـــــ اب زینبؑ اپنے جوان کو خون میں نہایا ہوا دیکھے گی ـــــ اب زینبؑ اپنے اکبرؑ کا ماتم کرے گی ـــــ بیٹا! یہ کیا کہہ دیا ـــــ؟ اکبرؑ خاموش کھڑے رہے۔ پھوپی امّاں جلدی فرمائیے۔ دشمن بڑھتے چلے آ رہے ہیں ـــــ جوان بیٹا اور باپ پر طعنے سُن سکے۔ یہ

کیسے ممکن ہوگا۔ ؟ پھوپی اماں! اگر آپ کا اکبرؑ میدان میں نہ گیا اور بابا پر کوئی آنچ آگئی تو محشر میں کیا ہوگا۔ ؟ جب دادی اماں سوال کریں گی ۔ زینبؑ! تجھے اکبرؑ پیارا تھا اور میرا حسینؑ پیارا نہیں تھا؟ تو کیا جواب دیجیے گا۔ ؟ حسینؑ پر مصیبت کا ذکر سُنا تو زینبؑ کا دل تڑپ گیا ۔ فرمایا، جاؤ اکبرؑ جاؤ ۔ بیٹا! اگر تمھارے قربان ہو جانے سے میرا حسینؑ بچ جائے تو ہزار اکبرؑ قربان کر سکتی ہوں۔

پھوپی سے اجازت لے کر اکبرؑ نے بیبیوں کو آخری سلام کیا ۔ خیمہ کے دروازے پر آئے ۔ پردہ اٹھا کر باہر نکلنا چاہا۔ ایک مرتبہ کسی نے بڑھ کے دامن تھاما ۔ اکبرؑ کہاں جا رہے ہو ۔ ؟ روایت میں کسی کا نام تو نہیں ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ کسی بزرگ نے روکا ہوتا تو بازو پکڑا ہوتا۔ یہ دامن کیوں ۔ ؟ عزادارو! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کمسن بہن نے آکر دامن تھام لیا ہو ۔ بھیا! تم میدان میں جا رہے ہو ۔ ؟ ہمارا کون پرسانِ حال ہوگا ۔ ؟ اکبرؑ! ہمارے حال پر بھی رحم کرو ۔

اکبرؑ پلٹے ۔ خیمہ میں آئے ۔ دوبارہ رخصت ہوئے ۔ پھر کسی نے روکا۔ راوی کہتا ہے کہ سات مرتبہ خیمہ کا پردہ اُٹھا اور گرا ۔ اکبرؑ بار بار پلٹ کر خیمہ میں گئے اور ایک مرتبہ سیدانیوں نے اپنے حلقے میں لے کر کہا ۔ اکبرؑ! جاتے تو ہو لیکن ہماری غربت کا خیال رکھنا ۔ یہ سُننا تھا کہ اکبرؑ تڑپ گئے۔ پلٹ کر کہا۔ بیبیو! تمھیں اپنی غربت کا خیال ہے اور میرے بابا کی بیکسی کا خیال نہیں ہے ۔ مجھے جلدی رخصت کر دو۔ یہ کہہ کر

بڑھے اور اب پردہ اٹھا کر یوں نکلے جیسے کسی بھرے گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔ باپ کے سامنے آئے۔ باپ نے پوچھا' بیٹا! رخصت لے آئے ۔۔۔ ؟ کہا ہاں بابا۔ مجھے پھوپی نے رخصت کر دیا اور سیدانیوں نے بھی رخصت دیدی۔ حسینؑ نے دھڑکتے دل کے ساتھ اکبرؑ کے چہرہ کو دیکھا ۔۔۔ اور اسلحۂ جنگ سجا کر گھوڑے پر بیٹھا کر کہا' جاؤ بیٹا خدا کو سونپا ۔۔۔ لیکن دیکھو میرے لال! جب تک میرا اور تمھارا سامنا رہے مڑ مڑ کر دیکھتے رہنا ۔۔۔ اکبرؑ چلے ۔۔۔ حسینؑ دل سنبھالے بیٹھے رہے۔ چند لمحے گذرے تھے کہ ایک مرتبہ اکبرؑ نے آہٹ محسوس کی جیسے کوئی آ رہا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھا کہ ضعیف باپ کمر پکڑے چلا آ رہا ہے۔ رک کر آواز دی بابا ۔۔۔! آپ نے تو رخصت کر دیا تھا۔ پھر اب کیسے تشریف لائے ۔۔۔ ؟ حسینؑ نے دل پکڑ کر کہا' بیٹا! کاش تم صاحبِ اولاد ہوتے تو تمھیں یہ اندازہ ہوتا کہ جوان بیٹے کو رخصت کرنے کے بعد باپ کے دل پر کیا گذرتی ہے ۔۔۔ جاؤ اکبرؑ جاؤ۔ بس حسینؑ تمھارا دیدار کر چکا۔

اکبرؑ چلے۔ حسینؑ بارگاہِ احدیت میں فریاد کر رہے ہیں۔ مالک! گواہ رہنا۔ شبیہہِ رسولؐ کو بھیج رہا ہوں ۔۔۔ اسے بھیج رہا ہوں جس کے چہرہ کو دیکھ کر نانا کی زیارت کیا کرتا تھا ۔۔۔ مالک اب شبیہہ پیغمبرؐ خاک میں ملنے جا رہی ہے۔

حسینؑ درِ خیمہ پر بیٹھے ہیں ۔۔۔ ادھر پالنے والی کا دل تڑپا ۔۔۔ ایک مرتبہ فضہؑ کو بلا کر کہا' فضہ جاؤ ۔۔۔ اور جا کر درِ خیمہ پر کھڑی

ہو جاؤ ــــ مولا کے چہرہ پر نظر رکھنا ـ جوان بیٹے کا معاملہ ہے اکبرؑ پر کوئی وقت پڑے گا تو چہرہ کا رنگ بدل جائے گا۔ ایک مرتبہ فضّہ نے دوڑ کر خبر سنائی۔ بی بی ـ! آپ کے اکبرؑ کی خیر نہیں ہے ـ آقا کے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے ـ شہزادی نے مولا کو بلایا ـ آقا میرے اکبرؑ کی خیر تو ہے ــــ؟ کہا، ہاں ـ اکبرؑ سلامت ہے لیکن ایک نامی پہلوان کا مقابلہ ہو گیا ہے ـ وہ سیر و سیراب ہے اور میرا اکبرؑ تین دن کا پیاسا ہے دعا کرو، اللہ میرے اکبرؑ کو فتح دے ـ پالنے والی کا دل تڑپا ـ سیدانیوں کو آواز دی ــــ بیبیو! آؤ مجھ دکھیا پر ایک وقت پڑا ہے ـ میں دعا کرتی ہوں، تم آمین کہنا ـ دعا شروع ہوئی ــــ اے یوسفؑ کو یعقوبؑ تک پلٹانے والے! میرے اکبرؑ کو پلٹا دے ـ دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ فضّہ نے آکر خبر دی ـ بی بی آپ کا لال میدان سے واپس آ گیا ہے ــــ دل ٹھہرنے ہی والا تھا کہ پھر خبر ملی ــــ بی بی! اکبرؑ پھر میدان میں گئے ــــ شہزادی کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئی ــــ ہائے میرا اکبرؑ پھر میدان میں گیا ــــ دیکھیں! مقدّر اب کیا دکھاتا ہے ـ ابھی اس اضطراب میں دل دھڑک رہا تھا کہ ایک مرتبہ خیمہ میں آواز آئی بنی ہاشم کے بچو! آؤ ــــ ضعیف باپ سے جوان بیٹے کا جنازہ نہیں اُٹھتا ــــ خیمہ کا پردہ اُٹھا ــــ زینبؑ نکلیں ــــ حسینؑ نے جنازۂ اکبرؑ کو رکھا ــــ سر پر ردا ڈالی ــــ ارے زینبؑ ـ! تم کیوں آئیں ــــ بھیّا، کیا کروں، تمھیں کیسے اکیلا چھوڑ دوں ــــ لاؤ بھیّا! میں اپنے لال کو اٹھا لوں گی ــــ میں نے بچپنے سے گودی میں اُٹھایا ہے

حسینؑ نے کہا، بہن واپس چلو۔ زینبؑ کو واپس لائے۔ درِ خیمہ تک پہونچایا۔

دل چاہتا ہے عرض کروں، آقا! ابھی تو زینبؑ کے سر پر چادر ہے ابھی خیمہ سے نکلنے میں کیا نقصان ہے۔ آقا اس وقت کیا ہو گا جب عصرِ عاشور زینبؑ جلتے خیمہ سے نکلیں گی۔ سر کے بال بکھرائے ہوئے منھ پر طمانچے مارتی ہوئی۔

وَامُحَمَّدَاہُ وَاعَلِیَّاہُ وَاحُسَیْنَاہُ

" وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ٥ "

۱۱

اَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِیعِ العَلِیمِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ ۝
بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ۝
اَلحَمدُ لِلّٰهِ رَبِّ العٰلَمِینَ ۝ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ سَیِّدِ الاَنبِیَآءِ وَالمُرسَلِینَ ۝ حَبِیبِ اِلٰہِ العٰلَمِینَ سَیِّدِنَا وَمَولَانَا اَبِی القَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّیِّبِینَ الطَّاهِرِینَ وَلَعنَةُ اللّٰهِ الدَّائِمَةُ البَاقِیَةُ عَلیٰ اَعدَآئِهِم اَجمَعِینَ مِنَ الاٰنِ اِلیٰ قِیَامِ یَومِ الدِّینِ اَمَّا بَعدُ فَقَد قَالَ اللّٰهُ الحَکِیمُ فِی کِتَابِهِ الکَرِیمِ
"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ"

(اور محمدؐ صرف "اللہ" کے رسول ہیں۔)

قرآنِ حکیم نے اِن دو لفظوں میں سرکارِ دوعالم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عظمت کردار اور بلندیٔ منزل کو یوں ہی سمیٹ دیا جیسے انسانی جسم میں عالمِ اکبر سمایا ہوا ہو۔ یا جس طرح نقطۂ "با" میں پورا قرآن سمٹ آیا ہو۔

سرکارِ دو عالمؐ کی حیاتِ طیّبہ کا مطالعہ اس بات کا گواہ ہے کہ حضورؐ کی زندگی ایک عالمِ اکبر ہے اور قرآنِ حکیم کا یہ فقرہ اس کا جسدِ اطہر حضورؐ کا کردار قرآنِ عظمت ہے، اور یہ فقرہ اس کا نقطۂ بار ــــ یہ تو مالکِ کائنات ہی جانتا ہے کہ وہ کس بلند کردار والے کو محمدؐ کہتا ہے۔ اُس کی نظر میں رسول ہونے کے لیے کس طہارتِ نفس ــــ بلندیٔ اخلاق ــــ عظمتِ کردار ــــ ثباتِ عزم اور شدّتِ استقلال کی ضرورت ہے لیکن جہاں تک حضورؐ کی زندگی کے جائزہ کا تعلّق ہے، تاریخ کے اوراق نے نشاندہی کی ہے کہ آپؐ نے تبلیغِ دین اور پیغامِ الٰہی کے پہونچانے میں کیا اہتمام برتا ہے اور کن شدائد و مصائب کا سامنا کیا ہے۔

رسالت ایک عظیم منصب ہے جسے خالقِ کائنات اپنے منتخب بندوں کو عطا کیا کرتا ہے اور جس پیغام کی جتنی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اتنی ہی عظیم شخصیّت کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ خدا کا آخری پیغام صبحِ قیامت تک رہنے والا تھا۔ خدا نے اس کے لیے جس نبی کا انتخاب کیا اُسے کمالات بھی اس قدر عطا کر دیے کہ عمرِ دنیا تک ترقی کرنے والا انسان بھی اس منزل تک نہ پہونچ سکے اور کسی دَور کے انسان کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ محمدؐ عربی کا مرتبہ ہم سے کمتر تھا اور اُن کا دین ہمارے ترقّی یافتہ ذہنوں کے لیے ناکافی ہے۔

انسان تو انسان کل کا مسلمان بھی معراجِ پیغمبرؐ کا ذکر سُن کر تعجّب کیا کرتا تھا کہ آسمانوں میں راستہ کیسے بنا ہوگا۔ چند لمحوں

میں اتنی طویل مسافت کس طرح طے ہوئی ہو گی۔ آسمانوں کے شگاف کے بغیر اوپر کیسے گئے ہوں گے ــــــ؟ وہ سواری کیسی ہو گی جس میں اتنی تیز رفتاری پائی جاتی ہو ــــــ؟ وہ جبرئیلؑ کیسا ہو گا جو آسمان کے تمام راستوں سے یوں باخبر ہو کہ چند لمحوں میں سیر کرا کر واپس لے آئے ــــــ؟

یہ عظیم تنگئ نظر اور کوتاہئ علم اور اس پر مزید یونان کا فلسفہ ــــــ فلسفۂ یونان سے مرعوبیت نے ذہنوں کو مفلوج بنا دیا تھا اور مسلمانوں نے عاجز آکر معراجِ روحانی کا سہارا لیا۔ آیتِ قرآنی کو جھٹلائیں تو ایمان جائے۔ فلسفۂ یونان کی تکذیب کریں تو علم کہاں سے آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھبراہٹ میں ایک درمیانی راستہ نکال لیا۔ حضورؐ معراج میں گئے ضرور مگر جسم کے ساتھ نہیں، بلکہ سماوات کی ساری سیر حضورؐ کی روحِ اقدس کا کارنامہ تھا جسمِ اطہر تو فرشِ خواب پر تھا، اور یہ مطلب اتنا قیمتی معلوم ہوا کہ اس کی تائید میں حدیثیں بھی تیار کیں اور زوجہ کی زبان سے گواہی دلوا دی کہ حضورؐ بسترِ استراحت پر تشریف فرما تھے۔

مسلمان کو کیا خبر کہ اس کی کوتاہئ نظر، مذہب کا کیا حشر کرے گی؟ یونان کا یہ فلسفہ حقائقِ اسلام کو کس ٹھکانے لگائے گا۔ اسے تو رائے قائم کرنے سے مطلب اور چند درہم و دینار مل جائیں تو حدیثیں وضع کرنے سے غرض ــــــ میں بھی سوچا کرتا تھا کہ جب مسئلۂ معراج اتنا مشکل ہے۔ راتوں رات سیر کی منزل اس قدر دشوار ہے کہ امتِ قرآن کے حلق سے بھی نہیں اُترتی تو مالکِ کائنات کو لے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی، اور اگر لے ہی گیا تھا تو بات

کو پردۂ راز میں رکھا ہوتا نہ مسلمانوں کو اطّلاع ہوتی، نہ ذہن بہکتے نہ فلسفہ کے مسائل اُلجھتے اور نہ عقائد خراب ہوتے ــــ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا. مالکِ کائنات لے گیا اور عجیب انداز سے لے گیا۔ لے گیا تو اتنا چھپاکر کہ پاس والوں کو بھی خبر نہ ہوئی اور اعلان کیا تو ایسا ڈنکے کی چوٹ پر کہ صبحِ محشر تک آنے والوں کو خبر ہو جائے۔

آج دَورِ حاضر کی بے پناہ ترقّیاں نہ ہوتیں تو مذہب کا یہ فلسفہ سمجھ میں بھی نہ آتا ــــ انسان اس طرح آگے نہ بڑھتا تو حقائقِ مذہب تشنہ ہی رہ جاتے۔ یہ ترقّی دنیا کا احسان ہے کہ حقائقِ مذہب کھُلتے جا رہے ہیں اور تائیدِ مذہب کو مواد ملتا جا رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ ترقّی کرنے والے ان حقائق سے بے خبر ہیں اور ان کی نفس پرستی اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ مذہب کے انکار ہی میں عافیت ہے اور توحید و رسالت سے فرار ہی میں آزادی کا تحفّظ ہے۔

اگر آج معراجِ پیغمبرؐ کا تذکرہ نہ ہوتا اور دنیا ترقّی کرتے کرتے چاند سورج کی منزلوں کو طے کر لیتی۔ انسانی قدم چاند کی زمین کو اپنی جوتیوں سے روند دیتے تو انسانی دماغ کہاں ہوتا اور کیا اسے یہ کہنے کا موقع نہ ہوتا کہ اتنا ترقّی یافتہ انسان مکّہ مدینہ کے راستوں پر اونٹ پر بیٹھ کر چلنے والے کی پیروی نہیں کر سکتا ــــ اونٹ پر بیٹھنے والا صحرا نشینوں کے لیے نظامِ زندگی پیش کر سکتا ہے، فلک پیمائی کے لیے نہیں۔

یہ احسان تھا معراجِ پیغمبرؐ کا، کہ اس نے ناطقے بند کر دیے۔ زبانوں

پر پہرے لگا دیے اور آواز دی خبردار ۔ ! میرے حبیبؐ سے مقابلہ نہ کرنا۔ ہزاروں وسائل اور آلات فراہم کر کے چاند تک جانا تمہارا کام ہے اور بُراقِ جذب و محبت پر بیٹھ کر عرشِ اعظم کی سیر کر کے چشمِ زدن میں پلٹ آنا محمدؐ کا کام ہے۔

دنیا معراجِ پیغمبرؐ پر ایمان لائے یا نہ لائے اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ قرآنِ حکیم میں اس معراج کا تذکرہ ہے۔ اس کے دامن میں سفرِ پیغمبرؐ کی داستان ہے اور یہ خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جس دَور کا انسان سیرِ سماوات کے بارے میں سوچنے سے قاصر تھا اس دَور میں قرآنِ حکیم اس سَیر کی روداد سنا رہا تھا۔

اربابِ نظر ! فیصلہ کریں جو خدا جہالت کے دَور میں اتنی عظیم داستان سُنا سکتا ہے۔ جو مالک انسانی بے خبری کے ماحول میں ان خصوصیات کی اطّلاع رکھتا ہے، اور دنیا کے لیے یہ اطّلاعات فراہم کر سکتا ہے، کیا اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنے حبیبؐ کو راتوں رات آسمانوں کی سیر کرا دے۔

یہ قرآنِ حکیم کا معجزہ تھا کہ اس نے دنیا کے اقرار و انکار کی پرواہ کیے بغیر قصّہ معراج کو بیان کر کے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا۔ میرا سابقہ مکّہ مدینہ کی قوم سے ہوتا تو میں ان کے جذبات کا خیال کر کے واقعہ پر پردہ ڈال دیتا، لیکن مجھے صبحِ محشر تک رہنا ہے اور پوری نسلِ انسانی کو چیلنج کرنا ہے، اِس لیے میں نے واقعہ کو محفوظ کر لیا ہے

اور آج بھی میرا اعلان ہے کہ سیرِ قمر کرنے والے اور ہیں اور سیرِ عرش کرنے والے اور۔ چاند پر جانے والے اور ہیں اور چاند کو دو ٹکڑے کرنے والے اور ـــــ ستاروں کی منزلوں کو ڈھونڈھنے والے اور ہیں اور ستاروں کو اپنی ڈیوڑھی پر بلانے والے اور ـــــ کائنات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان اور ہیں، اور کائنات کا اقتدار اپنی مٹھی میں رکھنے والے اور ـــــ یاد رکھو! جو اپنے نفس کا بندہ ہوتا ہے وہ پابندِ کائنات ہوتا ہے اور جو خدا کا بندہ ہوتا ہے وہ مختارِ کائنات ـــــ جو خدائے بے نیاز کو بھول جاتا ہے وہ ساری کائنات کا فقیر ہوتا ہے اور جو کنزِ مخفی کو پالیتا ہے وہ جناب امیرؑ ہوتا ہے۔

ایک معراج اور شق القمر ہی کا ذکر نہیں حیاتِ پیغمبرؐ کے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ خدا کا رسولؐ عظمتوں کی اس منزل پر فائز ہے جہاں تک پہونچنا ذہنِ انسانی کے لیے ناممکن ہے چہ جائیکہ جسمِ انسانی۔

دَورِ حاضر کی مدہوش کن ترقیوں میں ایک ترقی یہ بھی ہے کہ انسان نے ایسے آلات ایجاد کر لیے ہیں جن کے ذریعہ پورے مکان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر لیتا ہے۔ سیرِ قمر کے بعد یہ بات زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی لیکن ان کے دل سے پوچھیے جنھیں آسمانوں کی سیر ایک پہیلی معلوم ہوتی ہے۔ اور جو چاند اور سورج کے فاصلوں کو ایک افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ـــــ کہ آسمانوں کی سیر تو بڑی بات ہے زمین پر بھی

ایسا کوئی واقعہ ناممکن ہے۔ بھلا پوری زمین کیسے اُٹھائی جائے گی۔ اور اگر زمین اُٹھائی جائے گی تو عمارت کس طرح قائم رہے گی اور اگر عمارت قائم رہ جائے گی تو راستہ کس طرح طے ہوگا، اور اگر راستہ طے ہو جائے گا تو دوسری عمارت نصب کس طرح ہو گی۔؟

اس طرح کے بے شمار خیالات ذہنوں میں گونج رہے ہیں اور انسان ہر ترقّی کو ایک مضحکہ کا درجہ دے رہا ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ واقعات صحیح ہیں یا غلط — دنیا انھیں مانتی ہے یا نہیں۔ مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جب آج کے ترقّی یافتہ دور میں یہ باتیں مضحکہ خیز نظر آتی ہیں، تو کل کے جاہلیت زدہ ذہنوں میں یہ بات کیسی رہی ہو گی اور ان کے سامنے اپنی گفتگو کس قدر دشوار رہی ہو گی — لیکن اللہ نے مصلحتِ پیغمبرؐ، کہ حضورؐ نے کل کے حالات میں انھیں جاہلی ذہنوں کے سامنے ایک اشارے سے درخت کو اپنے پاس بلا لیا اور پھر واپس بھی کر دیا، تاکہ آنے والی دنیا اپنی ترقّیوں پر ناز نہ کر سکے اور اسے اندازہ رہے کہ جو کام آج تم آلات و وسائل کی مدد سے کر رہے ہو کل اس سے بالاتر کام خدا کا رسولؐ اپنی روحانی طاقت سے کر چکا ہے۔ وسیلہ کا محتاج انسان ہوتا ہے اور وسائل سے بے نیاز نمائندہ ربُّ العالمین —

عزیزانِ محترم — ! انسانی ترقّی اس منزل پر آچکی ہے جہاں انسان ہر مخلوق کے احساس و شعور کا اندازہ کرنے لگا ہے۔ کل یہ بات مسلّمات میں تھی کہ جمادات و نباتات میں شعور کا گذر نہیں ہے۔ یہ بات حیوانات کے ساتھ

مخصوص ہے اور منزلِ حیوانیت پر پہونچنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے
لیکن آج کے انسان نے سائنسی آلات کی مدد سے یہ اندازہ بھی کر لیا ہے
کہ دنیا کی ہر مخلوق میں ایک طرح کا شعور پایا جاتا ہے۔ پتھر بھی درد و رنج
کا احساس رکھتے ہیں اور نباتات کو بھی اپنے دُکھ درد کا اندازہ ہوتا ہے۔
بعض پتھّروں سے پانی کے قطرے کا ٹپکنا علامت ہے کہ اس کے احساس
کی گرمی قطرۂ اشک بن گئی ہے۔ درختوں میں طرح طرح کے تغیّرات کا پیدا
ہونا دلیل ہے کہ موسم کے تاثّر نے اس میں یہ انقلاب پیدا کیا ہے۔ ممکن ہے
کہ انسان حیوان کے شعور میں اتنا فرق ہو کہ انسان کو اپنے شعور کا شعور بھی
ہوتا ہو اور حیوان میں شعور کے شعور کی طاقت نہ ہو ۔ لیکن اسے بھی
کون جانتا ہے جبکہ خود قرآن مجید نے پتھروں کے احساس کی تعریف
کی ہے اور ایک مقام پر پتّھر کو انسانی دل سے بہتر قرار دیتے ہوئے ارشاد
کیا ہے کہ " پتّھر سے تو پانی بھی نکل آتا ہے لیکن انسان کے دل پر تو اتنا
بھی اثر نہیں ہوتا۔"

دوسرے مقام پر خود اپنی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
اعلان کیا ہے کہ " اگر میں اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیتا تو وہ بھی خوفِ
خدا سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے ۔"

خوفِ خدا کا تصوّر کیا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ قرآنِ حکیم
کے ذریعہ اللہ نے اس کی قوّتِ احساس کا اندازہ کرایا کہ اسے (پہاڑ کو)
دکھ درد کا اندازہ ہے۔ اُردو کے عظیم شاعر غالب نے اسی نکتہ کی طرف

اشارہ کیا تھا: ؎

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

مقصد یہی ہے کہ غم انسان کو دیا گیا ہے تو اس کے دل پر اثر نہیں ہوتا ورنہ یہی اگر شرار بنا کر پتھر کو دیدیا جاتا تو وہ خون کے آنسو روتا اس لیے کہ اس کی قوّتِ احساس بہت سے انسانوں سے بہتر ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے حالات میں بھی انسان قلّتِ احساس کو "سنگدلی" سے تعبیر کرتا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر پتّھر کو زبان دیدی جاتی اور اسے بھی اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت ہوتی تو وہ ایسے انسانوں کے خلاف احتجاج کرتا جن کی قوّتِ احساس جمادات و نباتات کے برابر بھی نہیں ہے۔

غالبؔ کے کلام کو شاعرانہ تصوّرات کا درجہ دیا جا سکتا ہے لیکن اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ غالبؔ اتنا عظیم تصوّر بھی کہیں سے لیکر آئے ہیں۔ ان کا ذہن بھی مافوقِ کائنات نہیں ہے کہ اُنھوں نے ایک اتنا عظیم تصوّر پیش کر دیا۔ ۔۔۔ یہ ان کے لاشعور کی آواز ہے جسے اُنھوں نے خود محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو اکثر نقّادانِ سخن محسوس نہیں کر سکتے۔

عزیزانِ محترم ـــ ! کل جب فراقِ رسولؐ میں درخت کے گریہ کی بات کہی جاتی تھی تو اہلِ دنیا مذاق اُڑایا کرتے تھے اور آج جب سائنس نے اس مضحکہ کو حقیقت سے قریب تر کر دیا ہے تو ہر تازہ ذہن تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے اور ہر دماغ تائید کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ اب اندازہ ہوتا ہے

کہ روحانی کمالات درختوں کو بھی متاثر بنا سکتے ہیں ـــــ تو اب مجھے کہنے دیجیے کہ جب رسولِ اکرمؐ کے عارضی فراق میں درخت صدائے نالہ بلند کر سکتا ہے تو جب رسولِ اکرمؐ کا فرزند صحرائے کربلا میں بھوکا پیاسا شہید ہوگا تو کیا تعجب ہے کہ آسمان سے خون برس رہا ہو اور زمین سے جو پتھر اُٹھایا جائے اس کے نیچے خونِ تازہ جوش مار رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات نے حسینؑ کا سوگ منایا ہے اور مالک کائنات نے پوری دنیا کو زہراؑ کے لال کا سوگوار بنا دیا ہے۔ کیوں نہ ہوتا۔ زہراؑ نے اپنا بھرا گھر راہِ خدا میں دے دیا، لیکن یہ حسرت لیکر دنیا سے گئیں کہ کاش میں زندہ رہتی تو اپنے حسینؑ کا ماتم کرتی ـــــ ابوالحسنؑ رہتے تو اپنے حسینؑ پر روتے ـــــ بابا رہتے تو اپنے نواسے کا غم مناتے ـــــ میرا حسنؑ ہی رہتا تو اپنے بھائی کا جنازہ اٹھاتا ـــــ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ تسلسلِ امامت درمیان میں ہے اور سب کو پہلے رخصت ہونا ہے ـــــ آخر میں ایک حسینؑ کو تنہا کربلا کے میدان میں رہ جانا ہے جس کے لیے زہراؑ کو فکر ہے ـــــ بابا ـــــ! جب کوئی نہ رہے گا تو میرے حسینؑ پر روئے گا کون ؟

مرسلِ اعظمؐ نے تسلّی دی، بیٹی ـــــ! خدا ایک قوم کو پیدا کریگا جس کے مرد، مَردوں کا ماتم کریں گے اور اس کی عورتیں، عورتوں پر آنسو بہائیں گی۔

میرا دل چاہتا ہے عرض کروں حضورؐ ـــــ! بیٹی کے دل کو سنبھالیے، یہ قوم کی کیا ضرورت ہے ـ؟ فرما دیجیے زینبؑ رہے گی، امِ کلثومؑ صفِ عزا

بجھائے گی۔ میرا سیدِ سجّاد ماتم کرے گا ــــ لیکن عزادارو! ایسا نہیں ہوا پیغمبرؐ نے قوم ہی کا نام لیا۔ تو اب دو ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں ــــ یا تو زہرا کا مقصد تھا کہ قیامت تک یہ ماتم کس طرح قائم رہے گا اور باپ نے تسکین دی کہ ہر دَور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہیں گے جو اپنی زندگیوں کو تیرے لال کے لیے وقف کر دیں گے۔

کہیے تو عرض کروں شہزادی! آئیے اور آکر دیکھیے۔ آج اس قوم کا ہر بچہ، اس قوم کی ہر خاتون اور اس قوم کا ہر بزرگ و جوان آپ کے لال کا ماتم کر رہا ہے۔ شہزادی! انھوں نے کبھی اپنے عزیزوں کے غم میں سر و سینہ نہیں پیٹا ــــ انھوں نے کبھی اپنے باپ کے ماتم میں خون نہیں بہایا۔ انھوں نے کبھی اپنے رشتہ داروں کا یوں غم نہیں منایا۔ یہ صرف آپ کے لال کا ماتم ہے کہ ہر ماں اپنے بچّے کے جسم سے بہتا ہوا خون دیکھ کر خوش ہو رہی ہے ہر باپ اپنے فرزند کو اپنے سے جدا کرنے پر تیار ہے۔

شہزادی ــــ اب اس قوم کے دن، دن نہیں رہے۔ اس کی راتیں آرام کے لیے نہیں رہیں۔ اسے صرف آپ کے لال کے ماتم کی دُھن ہے۔ اس کے ذہن پر اپنا گھر نہیں ہے کربلا ہے۔ اس کی نظروں میں اپنے لال نہیں ہیں کربلا کے نونہال ہیں۔ اس کی مائیں بچّوں کو دیکھتی ہیں تو انھیں رباب کی اُجڑی گود نظر آتی ہے۔

عزادارانِ حسینؑ! مرسلِ اعظمؐ کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیٹی زہراؑ! تیری زینبؑ تو رہے گی ــ تیری اُمِ کلثومؑ تو رہے گی ــــ

تیرا سجاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو رہے گا لیکن انھیں رونے نہ دیا جائے گا ان کے ماتم پر پابندی ہو گی، ان کی آنکھوں سے آنسو گریں گے تو اشقیا انھیں نوک نیزہ سے اذیّت دیں گے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ مرسلِ اعظمؐ نے مردوں کے ساتھ عورتوں کا نام بھی لیا۔ گویا مقصد یہی یہ تھا کہ فاطمہؑ تیری بیٹیاں کیا ماتم کریں گی۔ ان کی حالت تو خود ایسی ہو گی کہ آنے والی قوم ان کی مظلومیت کا ماتم کرے گی۔

اربابِ عزا ـــــ ! مجلس کا سلسلہ تمام ہو رہا ہے۔ آج ہمیں اور آپ کو زہراؑ کے لال کا ماتم کرنا ہے۔ حسینؑ کی دُکھیا ماں رومال لے کر آگئی ہے اور ایک ایک ماتم دار کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ رہی ہے۔ اللہ رے وضع داری زہراؑ۔ خود بھی آنسو بہائیں اور دوسروں کے آنسو بھی جمع کریں۔

فاطمہؑ کربلا میں کتنا روئیں کون جانتا ہے۔ کسی کا زہراؑ جیسا دل اور حسینؑ جیسا لال ہو تو اندازہ کرے کہ ایسے لال کی شہادت پر ایسی ماں کا کیا حال ہوتا ہے۔ ہاں تاریخ کربلا نے چند منظر بیان کیے ہیں۔

آپ برابر سنتے رہتے ہیں کہ عاشور کی رات جب فرزندِ رسولؐ مقتل کی طرف گئے تو ایک نشیب سے کسی بی بی کے رونے کی آواز آئی۔ آپ نے پہچانا، وہ کون بی بی تھی، اور کیا کر رہی تھی ؟ عجب نہیں مادرِ حسینؑ بقیع سے آئی ہوں ـــ میرے لال ! کل تو اسی زمین پر گھوڑے سے گرے گا۔ میرے حسینؑ ! آ تیرے مقتل کی خاک کو اپنے بالوں سے صاف کر دوں۔ حسینؑ میرے آنسو کس طرح تھمیں، بیٹا ! کل یہاں میرا باغ اُجڑ جائے گا۔ جس کے جسم پر میں نے ہلکی سی

تکلیف برداشت نہیں کی کل اس کا جسم تیروں پر رہے گا۔ جس گلے کے میں نے بوسے لیے ہیں اس پر شمر کا خنجر چلے گا ـــ واحسیناہ واحسیناہ۔

حسینؑ پلٹ کر خیمہ میں آئے۔ چاہنے والا دروازہ پر بیٹھا ہے ایک مرتبہ بہن نے کہا، بھیا! آپ نے اپنے ساتھیوں کو آزمالیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو میدان میں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ حسینؑ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ صحابی دوڑا ہوا مجمعِ اصحاب میں آیا۔ حبیب، زُہیر، مسلم! غضب ہو گیا ـــ دخترِ زہراؑ کو ہماری وفا پر اعتماد نہیں ہے۔ چلو جلدی چلو۔ چل کے زینبؑ کو اپنی وفا کا اعتماد دلائیں ـــ اصحاب اُٹھے۔ تلواریں نیام سے نکالیں۔ نیام کو توڑ کر پھینکا۔ درِ خیمہ پر آکر آواز دی ـــ علیؑ کے لال! دخترِ زہراؑ سے کہہ دیجیے، یا تو ہماری وفا پر بھروسہ کر لیجیے یا ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم اپنے گلے اپنے ہاتھ سے کاٹ کر پھینک دیں۔ ہم اس دن زندہ رہ کر کیا کریں گے جب دخترِ زہراؑ کو ہماری وفا پر اعتماد نہ ہو گا۔

حسینؑ نے سمجھایا، زینبؑ کا دھڑکتا ہوا دل ٹھہرا۔ عاشور کی رات تمام ہوئی لیکن، عزادارو! جس زینبؑ نے اصحاب کے یہ حوصلے دیکھے ہوں گے جب اس نے عصرِ عاشور بھائی کو رخصت کیا ہو گا اس کے دل پر کیا گذری ہو گی۔ کیا دل نے نہ پکارا ہو گا۔ حبیب، مسلم، زُہیر! اب کہاں ہو ـــ؟ میرا حسینؑ اکیلا رہ گیا ہے اور عجب نہیں شہزادی نے مقتل کا رُخ کر کے آواز دی ہو۔ اکبرؑ آؤ، عونؑ و محمدؑ اٹھو، قاسمؑ کہاں گئے۔ عباسؑ کیا تم بھی سو گئے۔ تمھارا مولا اکیلا رہ گیا۔

اللہ رے حوصلۂ زینبؑ۔ بھائی کو کلیجے سے لگایا، گلے کے بوسے لیے، رخصت کیا۔ گھوڑے پر سوار کیا۔ عزادارو! کبھی کسی بہن نے اپنے بھائی کو مرنے کے لیے رخصت کیا ہے۔؟ یہ زینبؑ ہی کا کلیجہ تھا کہ اپنے ہاتھوں سے گھوڑے پر سوار کر دیا۔ حسینؑ مقتل کی طرف چلے۔ زینبؑ کا دل تڑپا۔ بھیّا۔! بہن نے سوار تو کر دیا ہے لیکن دل تڑپ رہا ہے کہ اگر تمھیں اُترنا ہوگا تو کون سہارا دے گا۔

ایک مرتبہ فضائے کربلا میں آواز گونجی۔ زینبؑ گھبرانا نہیں ــــــ جس نے چکّی پیس پیس کر پالا ہے وہ اپنی گودی میں سر رکھ لے گی۔ مدینہ سے رسولؐ آئیں گے۔ نجف سے علیؑ آئیں گے بقیع سے زہراؑ آئیں گی، اور اپنے حسینؑ کو سہارا دیں گی۔

روایت کہتی ہے کہ جس وقت شمر کا خنجر حسینؑ کے گلے پر چل رہا تھا، تو ایک آواز گونج رہی تھی "میرے لال، میرے حسینؑ تجھے میری نگاہوں کے سامنے ذبح کر دیا۔ بیٹا! تجھے پانی بھی نہیں ملا۔ ہائے حسینؑ۔ ہائے میرے لال۔

"اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔"

۱۲

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ وَالتَّحِیَّۃُ وَالْاِکْرَامُ عَلٰٓی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ وَسَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ وَاللَّعْنَۃُ الدَّآئِمَۃُ عَلٰٓی اَعْدَآئِھِمْ وَقَتَلَتِھِمْ اَجْمَعِیْنَ مِنَ الْاٰنِ اِلٰی قِیَامِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۝"

("اور محمدؐ صرف (اللہ کے) رسول ہیں")

مقامِ محمدیت کا حامل، عظمتِ رسالت کا مالک ۱۸ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کی دوپہر کو ولایتِ علیؑ کا اعلان کر کے اپنی رسالت کو منزلِ تکمیل تک پہونچا کر ۲۸ صفر سنہ ۱۱ھ کی صبح کو ابدی نیند سو گیا۔ کانٹوں پر چلنے والے کے زیرِ قدم گلشنِ جنت آگیا، پتھر کھانے والے پر پھولوں کی بارش ہونے لگی خس و خاشاک

برداشت کرنے والے کے گرد جنّت کی بہاریں طواف کرنے لگیں ___ مکّے کے مشرکین اور مدینہ کے منافقین کے مظالم برداشت کرنے والے کو جوارِ ربُّ العالمین مل گیا۔ اب اسلام ہے اور منزلِ تعمیل۔ علی ابن ابی طالبؑ ہیں اور ترویجِ دینِ مبین ___ نسلِ ابوطالبؑ ہے اور تحفّظِ رسالت کی ذمّہ داری۔

مولائے کائنات علیؑ بن ابیطالبؑ نے دین کو منزلِ تعمیل سے آشنا بنانے میں بے پناہ مصائب کا مقابلہ کیا۔ ۲۵ سال تک گوشہ نشین رہنا پڑا تو رہے۔ جمل و صفّین و نہروان کے میدانوں میں آنا پڑا تو آئے ___ منافقین کی ریشہ دوانیوں کا سامنا کرنا پڑا تو کیا ___ اور کسی منزل پر تبلیغِ دین سے قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔

یہ علی علیہ السّلام ہی کا کلیجہ تھا کہ جاگیر چھِن گئی تلوار نہیں اٹھائی ___ یہ علی علیہ السّلام ہی کا جگر تھا کہ گلے میں رسّی کا پھندا پڑ گیا اور سر نہیں اُٹھایا۔ یہ علی علیہ السّلام ہی کا حوصلہ تھا کہ سرِ دربار زہراؑ کی توہین کی گئی اور بد دعا کے لیے ہاتھ نہیں اُٹھائے ___ یہ علی علیہ السّلام ہی کا دل تھا کہ گھر میں آگ لگا دی گئی اور حملہ نہیں کیا۔

علیؑ و زہراؑ کے انھیں حوصلوں کی وارث بن کر ایک نسل سامنے آئی جن میں دو دین کے ذمّہ دار اور دو بھائیوں کے مقصد کی پاسبان۔ ضمانتِ دین امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے حصّے میں آئی اور مقصدِ حسنؑ و حسینؑ کی اشاعت زینبؑ و امِ کلثومؑ کے حصّے میں آئی۔

کائنات میں کسی انسان نے دین کی خاطر اتنی قربانیاں نہیں دیں جتنی قربانیاں فاطمہ زہرا کو دینا پڑی ہیں۔ خلیلِ خدا نے ایک اسماعیلؑ دیا تھا ـــ آدمؑ کو ایک ہابیل کا داغ اُٹھانا پڑا تھا ـــ ایوبؑ کو اپنے ذاتی مصائب اُٹھانا پڑے تھے ـــ یونسؑ کو خود شکمِ ماہی میں رہنا پڑا تھا۔ موسیٰؑ کو خود دریائے نیل سے گذرنا پڑا تھا۔ عیسیٰؑ کو خود ستمِ یہود کا سامنا کرنا پڑا تھا ـــ لیکن فاطمہ زہراؑ ؟ اپنے مصائب تو ایک طرف گھر جلا، وارث کے گلے میں رسّی بندھی ـــ جاگیر چھینی گئی ـــ حق سے محروم کیا گیا ـــ پسلیاں توڑی گئیں ـــ دروازہ پہلو پر گرایا گیا۔ شکم میں محسن کی شہادت ہوئی۔

اور اس کے علاوہ مالک نے فاطمہؑ کو چار اولاد دی۔ چاروں کو دینِ خدا پر قربان کر دیا۔ حسنؑ کو زہرِ دغا کے لیے پیش کر دیا ـــ حسینؑ کو خنجرِ جفا کے لیے دیدیا ـــ زینبؑ و اُمِ کلثومؑ کو بازاروں اور درباروں کے لیے پیش کر دیا ـــ اور آواز دی میرے مالک ! اگر تیرے دین کو یہ بھرا گھر درکار ہے تو مالک ! میرے حسنؑ کا کلیجہ حاضر ہے ـــ میرے حسینؑ کا گلا حاضر ہے۔ میری زینبؑ کی ردا حاضر ہے۔ میری اُمِ کلثومؑ کے بازو حاضر ہیں۔ میرے محسن کی ننھی سی جان حاضر ہے۔ فاطمہؑ یہ سب کچھ دیدے گی لیکن تیرے دین کی بربادی برداشت نہ کرے گی۔ اس دین کیلئے میرے بابا کی زندگی مصائب کا شکار رہی ہے، اِس دین کیلئے میرے وارث نے ہر مصیبت برداشت کی ہے۔ اِس کیلئے میری ملیکۃ العرب ماں نے فاقے کیے ہیں۔ اِس دین کے لیے میرے

بزرگوں نے درختوں کے پتّے چبا کر زندگی گذاری ہے تو میں اس کی بربادی کیونکر برداشت کروں گی۔

میرے مالک! تو گواہ رہنا یہ مصائب دِلوں پر پڑتے تو شبِ تاریک کی طرح سیاہ ہو جاتے۔ یہ مصائب پہاڑ پر پڑتے تو ٹکڑے ہو جاتے ــــ یہ مصائب خاصانِ خدا کو دیدیے جاتے تو دل لرز جاتے ــــ لیکن یہ تیری زہرا ہے جو شکوہ نہیں کرتی ــــ تیری کنیز ہے جو فریاد نہیں کرتی۔

مالک! گواہ رہنا۔ زہرا ہمیشہ خاموش نہیں رہے گی۔ تبلیغ دین کی منزلیں ختم ہو جائیں گی، تو زہرا بولے گی اور تیری کنیز تیری بارگاہ میں فریادی بن کر آئے گی۔

مالک! میں اپنی داستان میدان محشر میں سناؤں گی جب میرے ہاتھوں میں، میرے عبّاسؑ کے کٹے ہوئے ہاتھ ہوں گے، میری گود میں میرے اصغرؑ کا لاشہ ہوگا۔ میرے پاس میرے حسینؑ کا تیروں سے چھلنی پیراہن ہوگا۔ ــــ اور میں تیرے عرش کا پایہ پکڑ کر فریاد کروں گی۔ اے عادلِ حقیقی ــــ! فاطمہؑ تجھ سے انصاف چاہتی ہے، فاطمہؑ نے تیرے لیے سارا گھر لٹا دیا ہے ــــ مالک! اب میں کچھ نہیں چاہتی۔ صرف ایک التجا ہے کہ میرے لال کے عزاداروں کو معاف کر دے۔

مالک! انھوں نے اس کا ماتم کیا ہے جس کے وارث اس کا ماتم نہیں کر سکے ــــ مالک! انھوں نے اُس کی صفِ عزا بچھائی ہے جس کی

ماں کربلا کے میدان میں نہ تھی کہ اپنے لال کی صفِ عزا بچھاتی۔

مالک۔! یہ انھیں کے آنسو ہیں جنھیں اپنے رومال میں جمع کر کے لائی ہوں ـــــ یہ انھیں کے خونِ جگر کے قطرے ہیں جنھیں تیری بارگاہ میں سمیٹ کر لائی ہوں۔

عزادارانِ حسینؑ! کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس وقت محشر کا کیا عالم ہوگا ـــــ فاطمہؑ کے بال کھلیں گے تو کیا منظر ہوگا۔ ہمیں تو اتنا یاد ہے کہ کل وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد جب ان بالوں کے کھلنے کا ذکر آگیا تھا تو مسجدِ پیغمبرؐ کی دیواریں بلند ہو گئی تھیں۔

..... دخترِ پیغمبرؐ نے سچ کہا تھا کہ اگر یہ مصائب دنوں پر پڑتے تو وہ راتوں کی طرح سیاہ ہو جاتے ـــــ اس کا اندازہ تو کربلا کے میدان میں ہوا ـــــ جب حسینؑ کے گلے پر خنجر چل رہا تھا اور زمین کو زلزلہ تھا ـــــ آفتاب گہن میں چھپا ہوا تھا .... فرات کی موجیں سر پٹک رہی تھیں ـــــ سیاہ آندھیاں چل رہی تھیں اور آسمان کے ستارے گریبان چاک کر کے باہر آ گئے تھے ـــــ زمین خون اگل رہی تھی اور آسمان سے خون کی بارش ہو رہی تھی۔

کاش کوئی باشعور ہوتا جو اندازہ کرتا کہ جب اس کائنات کی یہ حالت تھی ـــــ جب زمین و آسمان زیر و زبر ہو رہے تھے تو اس فاطمہؑ کا کیا حال ہوگا جس نے حسینؑ کو پالا تھا ـــــ اس نبیؐ کی کیا حالت ہوگی جس نے حالتِ نماز میں اپنی پشت پر بٹھایا تھا ـــــ اس علیؑ کے دل پر کیا گذری

ہو گی جس نے محبت سے اس گلے کو بوسہ دیا تھا۔

روتے والو! دل کو سنبھال سکو تو سناؤں ـــ اور آنسوؤں کو روک سکو تو تمھارے ذہن کو اس منظر کی طرف لے چلوں ـــ ایک لمحہ کے لیے تصور کرو کہ جب حسینؑ کے گلے پر چلتا ہوا خنجر دیکھ کر کائنات منقلب ہو گئی تو جب خیمۂ عصمت میں آگ لگی ہو گی ـــ جب زہراؑ کی بیٹیوں کے سروں سے چادریں چھینی ہوں گی ـــ جب سکینہؑ کے منھ پر طمانچے لگے ہوں گے، تو اس کائنات کا کیا حال رہا ہو گا۔

اور ایسی آندھیوں کے درمیان ـــ ایسے گہن کے عالم میں جب رات آئی ہو گی تو وہ رات کتنی تاریک رہی ہو گی، اور اس رات میں ان بیکس سیدانیوں کا کیا عالم ہو گا جن کے جلے ہوئے خیمہ میں شمعیں کیسی اُمیدوں کے چراغ بھی نہیں ہیں ـــ جن کی خاکستر شدہ قناتوں پر نورِ قمر کیسا نورِ نظر کا سایہ بھی نہیں ہے ـــ ہائے وہ شامِ غریباں کا سناٹا ـــ وہ کربلا کا جنگل اور وہ جنگل کا سکوت ـــ وہ خیموں کے جلنے کی ہلکی ہلکی روشنی ـــ وہ چاروں طرف وارثوں کے لاشے ـــ وہ اصغرؑ کا خالی جھولا ـــ وہ رباب کی گود کی گرمی ـــ وہ لیلیٰ کا دھڑکتا ہوا دل ـــ وہ اُمِ فروہ کا اضطراب ـــ وہ قاسمؑ و عونؑ و محمدؑ ـــ اور عباسؑ و اکبرؑ کی یادیں اور وہ بیکس شہزادیاں ـــ وہ جلتی ریتی اور وہ عابدِؑ بیمار۔

کون ہے جو دلاسہ دے ـــ ؟ کون ہے جو پاسبانی کرے ـــ ؟

کون ہے جو بیکسی کے عالم میں لٹی ہوئی شہزادیوں کے دلوں کو سہارا دے ؟
کوئی نہیں ــــ صرف کربلا کی خاک ہے جو اُڑ اُڑ کر سروں کا پردہ کر رہی ہے۔ رات کی تاریکی ہے جو چہروں کو نامحرموں کی نگاہوں سے بچائے ہوئے ہے۔ بیکسی ہے جو ماتم کر رہی ہے۔ تنہائی ہے جو آنسو بہا رہی ہے۔ ــــ سناٹا ہے جو نوحہ خوانی کر رہا ہے ــــ بھیانک جنگل ہے جو غمگساری کا فرض انجام دے رہا ہے اور ایسے میں علیؑ کی بیٹی ہے جو ایک ایک بی بی کو سمجھا رہی ہے۔ کبھی لیلیٰ کو اُن کے لال کا پرسہ دیتی ہے۔ ــ کبھی اِم فروہ کے ساتھ بیٹھ کر قاسمؑ کا ماتم کرتی ہے ــ کبھی رباب کے ساتھ اصغر کا ماتم کرتی ہے ــ کبھی فرات کی طرف نظر مڑ جاتی ہے، تو عباسؑ کو یاد کرتی ہے ــــ اور کبھی ہجوم مصائب سے ایک لمحہ کی فرصت ملتی ہے تو اپنے حسینؑ کو یاد کرتی ہے ــــ اور ایسے ہی میں کبھی کبھی عونؑ و محمدؑ کی یاد آواز دیتی ہے اماں ــــ ! اسی مقتل میں ہم بھی ہیں اماں آیئے، ہمیں بھی گلے لگا لیجیے ــــ اماں۔ ! آیئے دو لمحہ کے لیے ہمارے پاس بھی بیٹھ جایئے۔

ہائے زینبؑ ــــ خدا کسی کو ایسا بیکس نہ بنائے جیسے زینبؑ ــــ کون تھا جو زینبؑ کو سہارا دیتا ــــ ؟ کون تھا جو اس درد کا اندازہ کرتا ــــ ؟ کس کے پہلو میں ایسا دل تھا جو یتیموں کے غم کا احساس کرتا ــــ ہاں، روایت کا اشارہ ہے کہ ایک مرتبہ علیؑ کی بیٹی نے کسی کو آتے ہوئے دیکھا ــــ آواز دی، اے سوار ! ادھر قدم آگے نہ بڑھانا ــــ

ہمارے بچے دُکھ درد اُٹھا کر سو گئے ہیں ــــ ہمارے خیمے لٹ چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے بچوں کی نیند اُچٹ جائے ــــ اگر تجھے کچھ لینا ہی ہے تو صبح کو آکر جو کچھ ہو لے لینا ــــ اس وقت بچوں کو سو لینے دے۔

علیؑ کی بیٹی فریاد کر رہی ہے اور سوار کچھ نہیں سُنتا ــــ آگے بڑھتا چلا آتا ہے ــــ ایک مرتبہ جیسے ہی سوار قریب آیا ــــ شیرِ ذوالجلال کی بیٹی کو جلال آگیا۔ بڑھ کر لجامِ فرس پر ہاتھ ڈال دیا ــــ اے سوار میں بار بار کہہ رہی ہوں اور سُنتا نہیں ہے ــــ ارے میرا عباسؑ شہید ہو گیا ہے، میرا اکبرؑ مر گیا ہے، میرے عونؑ و محمدؑ نہیں رہے میرا قاسمؑ پامال ہو گیا ہے۔ تو کیا تو سمجھتا ہے کہ میں بالکل بے لبس ہو گئی ہوں۔؟ میں علیؑ کی بیٹی ہوں ــــ میرے پہلو میں شیرِ ذوالجلال کا دل ہے ــــ یہ سُننا تھا کہ ایک مرتبہ سوار نے چہرہ سے نقاب اُلٹ دی۔

ارے میری زینبؑ تو نے پہچانا نہیں ــــ میں تیرا باپ علیؑ ہوں علیؑ۔

باپ کا چہرہ دیکھنا تھا کہ بیٹی قدموں سے لپٹ گئی۔ بابا ــــ! اب آئے ہو جب گھر لُٹ گیا ــــ اب آئے جب خیمے جل گئے ــــ اب آئے جب چادریں چھن گئیں ــــ اب آئے جب بھیا کے گلے پر خنجر چل گیا۔ ــــ اب آئے جب سکینہؑ طمانچے کھا کر سو گئی ــــ اصغرؑ کا جھولا ویران ہو گیا، اور سیدانیاں بے والی و وارث ہو گئیں

"نہ قاسم نہ علی اکبر نہ عباس"

باپ نے بیٹی کی داستان سنی۔ دل کو سنبھالا ــــ آواز دی

زینبؑ ۔۔ ! ٹھہرو ٹھہرو ۔۔ بیٹی ! دل کو سنبھالو ۔۔ تم بیٹھو اب باپ نگرانی کرے گا۔

عزادارو ! کون جانتا ہے کہ علیؑ کب آئے اور زینبؑ کی ذمّہ داریاں کب ختم ہوئیں ۔۔ ہاں مقتل میں اتنا ضرور ملتا ہے کہ اسی رات کے سنّاٹے میں ایک مرتبہ زینبؑ اپنے بھیّا کی امانت سکینہ کو تلاش کرنے نکلی تھی اور جب ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک نشیب کے قریب پہونچی تھی تو وہاں سے کسی بچّی کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ جناب زینبؑ اور جناب اُم کلثومؑ آگے بڑھیں، کیا دیکھا۔ سکینہ ایک لاشۂ بے سر سے لپٹی ہوئی بین کر رہی ہے ۔۔ بابا ۔! میں لُٹ گئی ۔۔ بابا ۔! میں تم سے چھٹ گئی ۔۔ بابا ۔! گوشوارے چھن گئے ۔۔ بابا ۔! ذرا اُٹھ کے دیکھو یہ رخسار شمر کے طمانچوں سے نیلے ہو گئے ہیں۔

ثانیٔ زہراؑ آگے بڑھیں۔ بچّی کو اُٹھایا ۔۔ پوچھا۔ سکینہؑ یہ کس کا لاشہ ہے ۔۔ ؟ کہا پھوپھی امّاں ! یہ میرا بابا ہے ۔۔ کہا بیٹی اس لاشہ پر تو سر بھی نہیں ہے۔ اس کا لباس بھی لُٹ گیا ہے۔ تو نے کیسے پہچانا ۔۔ ؟ کہا۔ پھوپھی امّاں جب رات کی تاریکی نے ستایا تو میں مقتل میں بابا کو ڈھونڈتی ہوئی آئی ۔۔ آواز دے رہی تھی ۔۔ بابا ۔! تمھاری سکینہ آ رہی ہے۔ بابا، کہاں ہو بابا ۔۔ اپنی سکینہؑ کو اپنے پاس بلا لو ۔۔ ایک مرتبہ اس لاشۂ بے سر سے آواز آئی ۔۔ آؤ سکینہ آؤ ۔۔ تیرا باپ اس نشیب میں ہے۔ پھوپھی امّاں !

میں بابا کے لاشے سے لپٹی ہوئی بین کر رہی تھی تو ایک مرتبہ کٹی ہوئی گردن سے آواز آئی ــــ سکینہؑ ٹھہرو ــــ ٹھہرو سکینہؑ ــــ بیٹی میرا ایک پیغام لیتی جاؤ ــــ سکینہؑ ! میرے شیعوں تک میرا سلام پہونچا دینا، اور کہنا چاہنے والو ! جب ٹھنڈا پانی پینا تو مجھ بیکس کی پیاس کو یاد کر لینا۔ اور جب کسی غریب و بیکس کا ذکر آئے تو مجھ پر اس طرح آنسو بہانا جیسے میری ماں فاطمہ زہراؑ بین کرتی ہیں ــــ ارے میرے لال۔ ارے میرے حسینؑ ! واغربتاہ ــــ واحسیناہ

حسینؑ ــــ حسینؑ ــــ حسینؑ